سہ ماہی

تاریخ

۴۵

ایڈیٹر

ڈاکٹر مبارک علی

مجلس ادارت

پاکستان: ڈاکٹر سیّد جعفر احمد، ڈاکٹر روبینہ سہگل، جناب اشفاق سلیم مرزا،
پروفیسر ساجدہ وندل، پروفیسر پرویز وندل

بیرون پاکستان: پروفیسر ہربنس مکھیا (ہندوستان)، ڈاکٹر گیانندرا پانڈے (امریکہ)،
پروفیسر امتیاز احمد (ہندوستان)، ڈاکٹر حسن نواز گردیزی (کینیڈا)،
ڈاکٹر خضر انصاری (برطانیہ)، ڈاکٹر سارا انصاری (برطانیہ)،
ڈاکٹر کامران اصدر علی (امریکہ)، ڈاکٹر طاہرہ خان (امریکہ)

معاونین

ڈاکٹر انور شاہین، نوین جی۔ حیدر، ڈاکٹر ہما غفار، ڈاکٹر غافر شہزاد

تھاپ پبلی کیشنز، لاہور

جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ

خط و کتابت (برائے مضامین)
بلاک ا، اپارٹمنٹ ایف۔ برج کالونی، لاہور کینٹ
فون: ۰۴۲۔۳۶۶۶۵۹۹۷
ای۔میل: mubarakali21@yahoo.com

اہتمام: فکشن ہاؤس، لاہور۔۰۴۲۔۷۲۳۷۴۳۰
سرِ ورق: نین تارا
پرنٹرز: سید محمد شاہ پرنٹرز، لاہور
تاریخ اشاعت: اگست ۲۰۱۲ء
قیمت فی شمارہ غیر مجلد: ۳۲۰ روپے
قیمت فی شمارہ مجلد: ۴۰۰ روپے

تقسیم کار: فکشن ہاؤس
لاہور، کراچی، حیدر آباد

THAAP PUB LICATIONS
43-G, Gulberg III, Lahore
Tel: 042-35880822, Fax: 042-35725739
e-mail: thappublications@gmail.com

فہرست

ا۔ابتدائی گفتگو		7
۲۔تاریخ اور جنگ	اشفاق سلیم مرزا	9
۳۔جنگ اور تاریخ	ڈاکٹر مبارک علی	23
۴۔جنگ اور ادب	پروفیسر سحر انصاری	33
۵۔جنگ اور شعبہ طب	ڈاکٹر ٹیپو سلطان	44
۶۔مذہب اور جنگ بوسنیا کی خانہ جنگی کا ایک تنقیدی جائزہ	ڈاکٹر ریاض احمد شیخ	50
۷۔جنگ اور ذرائع ابلاغ	مقتدا منصور	65
۸۔جنگ اور سفارت کاری	ڈاکٹر مُطاہر احمد	78
۹ پیشہ ور اور کرائے کے فوجی	ڈاکٹر مبارک علی	84
۱۰۔صدارتی اظہار خیال جنگ اور تاریخ ___ چند زاویے	ڈاکٹر سیّد جعفر احمد	93
۱۱۔سترہویں صدی میں مشرق و مغرب کی دو عورتیں	زاہدہ حنا	105
۱۲۔خلافت تحریک کے تضادات/تاریخ کے المیے	حمزہ علوی/ترجمہ: ڈاکٹر ریاض احمد شیخ	121
۱۳۔اکبر اعظم: تیسرا باب بغاوت	ڈاکٹر احمد شبیر/ترجمہ: محمد نفیس	171

پھول وہ سارے گئے تو آخر کہاں گئے،
بیتا ایک زمانہ----------

پھول وہ سارے گئے تو آخر کہاں گئے،
بیت گئی ایک عمر-------

کنواریوں نے ایک ایک کر کے چن لئے سارے پھول،
لوگ نا جانے کب سمجھیں گے، کب جانیں گے لوگ نا جانے کب سمجھیں گے

کنواریاں سب گئیں تو آخر کہاں گئیں،
بیتا ایک زمانہ----------

کنواریاں سب گئیں تو آخر کہاں گئیں،
بیت گئی ایک عمر-------

کنواریوں نے ایک ایک کر کے ڈھونڈ لئے شوہر،
لوگ نا جانے کب سمجھیں گے، کب جانیں گے لوگ نا جانے کب سمجھیں گے

سارے شوہر گئے تو آخر کہاں گئے،
بیتا ایک زمانہ----------

سارے شوہر گئے تو آخر کہاں گئے،
بیت گئی ایک عمر-------

سارے شوہر بن کہ سپاہی چلے گئے لڑنے کو،
لوگ نا جانے کب سمجھیں گے، کب جانیں گے لوگ نا جانے کب سمجھیں گے

سارے سپاہی گئے تو آخر کہاں گئے،
بیتا ایک زمانہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

سارے سپاہی گئے تو آخر کہاں گئے،
بیت گئی ایک عمر۔۔۔۔۔۔۔

سارے سپاہی ایک ایک کر کے چلے گئے قبروں میں،
لوگ نا جانے کب سمجھیں گے، کب جانیں گے لوگ نا جانے کب سمجھیں گے

سارے قبریں گئی تو آخر کہاں گئیں،
بیتا ایک زمانہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

سارے قبریں گئی تو آخر کہاں گئیں،
بیت گئی ایک عمر۔۔۔۔۔۔۔

ساری قبریں ایک ایک کر کے پھول گئی پھولوں میں،
لوگ نا جانے کب سمجھیں گے، کب جانیں گے لوگ نا جانے کب سمجھیں گے۔

انڈیا کے صحافی / مصنف جاوید نقوی نے تاریخ اور جنگ کانفرنس کے موقع پر ایک گیت پڑھا۔ ان کے مطابق یہ گیت ایک Negro Spritual کا ترجمہ ہے جس کے مترجم حبیب تنویر ہیں۔

ابتدائی گفتگو

تاریخ کے جرنل کی جانب سے یہ 14 ویں تاریخ کانفرنس ہے۔ اس بار اس کا موضوع جنگ ہے جو کہ تاریخ کا ایک اہم حصہ اور کردار رہا ہے، اور کچھ مورّخ اور مفکر جنگ کو انسانی سماج کے لئے اہم قرار دیتے ہیں کہ اس کی وجہ سے لوگوں کی کاہلی، سستی، اور بزدلی دور ہوتی ہے اور جب قومیں حالت جنگ میں ہوتی ہیں تو اس وقت ان کی تخلیقی صلاحیتیں ابھرتی ہیں، نئی ایجادات ہوتی ہیں اور ٹکنالوجی میں ترقی ہوتی ہے۔ وہ جنگ کو معاشی ترقی کے لئے بھی ضروری خیال کرتے ہیں۔

لیکن دوسری جانب جنگ کی تباہ کاریاں، ہولناکیاں اور قتل و غارتگری ہے جس پر مورّخ، مفکر، شاعر و ادیب نظر ڈالتے ہیں۔ جنگ کے فوائد اکثر حکمراں طبقوں کے مفاد میں ہوتے ہیں، مگر اس کی تباہ کاریوں کا شکار عام لوگ ہوتے ہیں، اس لئے جنگ سے نفرت کی وجہ ان کے رویہ سے عیاں ہوتی ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ جنگ کے بارے میں لوگ کم بولتے تھے، خاص طور سے اگر جنگ میں مذہب اور قوم پرستی آجائے تو اس کی مخالفت کرنے والا دشمن اور غدار ہو جاتا تھا۔ مگر اب صورتِ حال بدل رہی ہے، جنگ کے ستائے ہوئے عام لوگ اب سڑکوں پر آجاتے ہیں، اور اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ اگرچہ سیاستداں، بڑے صنعت کار، اسلحہ کے بیوپاری اور حکمراں طبقے ان کی آواز سننے سے گریز کرتے ہیں اور جنگ میں لوگوں کو دھکیل دیتے ہیں، مگر ایک وقت آئے گا جب جنگ کے مخالفین کی آواز سنائی دے گی۔

اس وقت پاکستان جس قسم کی جنگ میں مصروف ہے، یہ ایک بے معنی اور غیر فہم جنگ ہے، جس میں وہ غیر ملکیوں کے مفاد میں خود کو الجھائے ہوئے ہے۔ یہ جنگ پاکستان کے

حکمراں طبقوں نے خود پر نازل کی ہے۔ امریکہ کی دوستی اور روس کی مخالفت سے یہ شروع ہوئی ہے اور دن بدن الجھتی چلی جارہی ہے۔ پاکستان کے حکمراں طبقوں میں یہ صلاحیت نہیں کہ اس دلدل سے نکل سکیں۔

ہم نے اپنے تخیل سے دشمن بنائے تھے، اور ان کے خلاف جنگ کے لئے لوگوں کو تیار کیا تھا، لیکن اب ہم خود اپنے لوگوں سے ایک نہ ختم ہونے والی جنگ لڑ رہے ہیں، اور ہم نہیں جانتے کہ اس جنگ کو کس جذبہ اور نظریہ سے لڑا جائے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ قوم کو جنگی جنون سے نکال کر انہیں حقیقت کی دنیا میں لایا جائے۔

تاریخ اور جنگ

اشفاق سلیم مرزا

جنگ ایک ایسا موضوع اور تعقل ہے جس کو عمومی طور پر منفی معنی پہنائے جاتے ہیں۔ لیکن مطالعہء تاریخ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ اب تک جو کچھ بیتا ہے جنگ اُس میں ایک ناگزیر اہمیت کی حامل ہے۔

جنگ کے بعد اُس کی ہولناکیوں، تباہ کاریوں اور انسانی جانوں کے ضیاع پر تو سب نوحہ کناں ہوتے ہیں۔ لیکن ساتھ ساتھ جنگی کامرانیوں کے شادیانے اور طبل بھی بجائے جاتے ہیں اکلیز (Achilles) سکندر، جولیس سیزر (Julius Cesear)، خالد بن ولید، نپولین اور عزیز بھٹی کی بہادری اور کامرانیوں کے گیت گائے جاتے ہیں۔ اپنے اپنے حوالوں سے اُن کے نام تاریخ کے نصابوں میں سنہرے حروف میں لکھے جاتے ہیں۔ ہمارے خطے کی دو بڑی رزمیہ نظمیں رامائن اور مہابھارت جنگوں کی کہانیاں رقم کرتی ہیں۔ رگ وید میں بیان کردہ، دریائے راوی کے کنارے لڑی جانے والی لڑائی دس راجن یدھ (Battle of Ten Kings) بھی ایسی ہی ایک داستان ہے۔ الغرض دنیا کا اولین ادبِ عالیہ رزمیہ نظموں پر مشتمل ہے۔ رامائن اور مہابھارت کا تو میں ذکر پہلے کر چکا ہوں اُن میں آپ ہومر (Homer) کی ایلیڈ (Illiad) بھی شامل کرلیں جو یورپی ادب کا باب اول تصوّر کی جاتی ہے۔

ہوسکتا ہے کہ آئندہ لمحات اور صفحات میں جو بات کی جائے وہ دنیا بھر میں اور پاکستان میں قائم امن کی انجمنوں اور پرچاروں کو ناگوار گذرے۔ لیکن میں وہ سب کہنے کا اختیار رکھتا ہوں جو میں نے تاریخ سے سیکھا ہے اور جو دنیا کے نامور نظریہ دانوں نے اپنے مکاتیب فکر کے

حوالوں سے بیان کیا ہے یعنی امن دو جنگوں کے درمیان وقفے کا دورانیہ ہے۔

(Peace is an interlude between two wars)

یونانی فلسفی ہراکلی ٹس (Heraclitus 475-335BC) ایک ایسا فلسفی ہے جسے ہیگل (Hegel) مارکس (Marx) نیٹشے (Nietzsche) کے علاوہ لینن (Lenin) نے بھی سراہا ہے۔ جنگ جسے عربی زبان میں جدل کہتے ہیں، اُس کے فلسفے کا بنیادی نقطہ ہے۔ تاریخ فلسفہ کے بہت سے ناقدین اُسے اولین جدلیاتی اور تغیراتی تعقلات کا بانی سمجھتے ہیں۔ وہ کہا کرتا تھا کہ کسی شے کی پیدائش ہی اُس کی تخریب ہے اور تخریب ہی پیدائش ہے۔ ہیگل نے اپنے تئیں اُسے یوں بیان کیا کہ ''کسی شے کی پیدائش کا لمحہ ہی اُس کی موت کا لمحہ ہے'' (Hegel.1976.129) ہراکلی ٹس نے یہ بھی کہا تھا کہ ہر شے اجتماع ضدین (Unity of Opposites) ہے اور یہ کہ ہر شے ہے بھی اور نہیں بھی اور اجتماع ضدین ہی دنیا کے وجود کو واجب بناتی ہے۔ دوسرے آج کے معنوں میں وہ (Conflict) کی بات کر رہا تھا۔ اس نقطہ نظر کی بازگشت بعد ازاں ہیگل اور خصوصاً مارکس کے فلسفہ جدلیاتی مادیت میں زیادہ مربوط طور پر سائنسی بنیادوں پر استوار ہوئی۔

پھر وہ کہتا ہے کہ جنگ سب کی جَد ہے اور سب کی حکمران (War is the father of all and king of all) (Thilly.1922.24) اگر ہم اس کی تشریح کریں تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ جدل انسانی زندگی کے فروغ اور نشوونما کی کلید ہے اور تاریخ کی اس کشمکش میں جس نے قائم رہنا ہوتا ہے وہ قائم رہتا ہے اور جس نے مٹنا ہوتا ہے وہ مٹ جاتا ہے۔ اس قائم رہنے اور مٹنے میں کسی نوحہ گری، ماتم گساری یا اخلاقی فرمان کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا، تاریخ ان تمام کمزور ڈھالوں کو روند کر آگے نکل جاتی ہے۔ آپ بھلے سینکڑوں سال نوحہ کناں رہیں یہ نوحہ گری آپ کو عصری طاقتوں کی صف اول میں جگہ نہیں دے سکتی۔ بے چارگی اور مظلومیت تاریخ کی نظروں میں مستحسن نہیں ہے۔ اس کے اپنے اصول ہیں جو آسمان کی طرف منہ کر کے آہ بکا کرنے سے حاصل نہیں ہوتے۔

جنگ نے تاریخ میں جن قدروں کو آگے بڑھایا یو جو تغیر و تبدل برپا کیا اُس کی چند مثالیں مہابھارت، ایلیڈ، سکندر اعظم اور نپولینائی (Neopoleanic) جنگوں کی مثالوں سے واضح

کرنے کی یہاں کوشش کی جائے گی۔

مہابھارت اُس کی پہلی مثال ہے اور دیکھتے ہیں کہ کرشن اور ارجن کے درمیان جو مکالمہ ہوا اور اُس کے جو اثرات مرتب ہوئے اُس کی تاریخ میں کیسے پذیرائی ہوئی۔

کرشن کا ارجن کے ساتھ یہ مکالمہ جو ایک درس کی شکل میں ہے بھگوت گیتا میں بیان کیا گیا ہے۔ شنکراچاریہ جب بھی بھگوت گیتا کا حوالہ دیتا ہے وہ کبھی تو بھگوت گیتا کہتا ہے اور کبھی صرف گیتا ہی کہتا ہے۔ عام طور پر اُسے گیتا ہی کہا جاتا ہے اور جو کوئی گیتا پڑھتا ہے عمومی طور پر یہی کہا جاتا ہے کہ وہ گیتا کا پاٹ کر رہا ہے۔ ایک عام رائے کے مطابق اس کا مصنف ویاس ہی بتایا جاتا ہے۔

مہابھارت جنگ سے پہلے ارجن اپنے ہی خونی رشتوں سے جنگ کرنے سے ہچکچا رہا ہے اور کرشن اُسے جنگ کے لئے آمادہ کر رہا ہے۔ کرشن ایسا کہنے پر راستی میں پناہ لے رہا ہے اور بار بار اس بات کی تلقین کر رہا ہے کہ اگر تو راستی پر ہے تو جنگ تم پر عین فرض ہے۔

جنگ شروع ہونے سے پہلے ارجن، کرشن سے جو اُس کے رتھ بان کے روپ میں ہے کہتا ہے اپنے ہی خون بھائیوں کو جنگ کے لئے تیار دیکھ کر میرے اعضاء مضمحل ہو رہے ہیں اور میرا منہ خشک ہو رہا ہے۔ میرا جسم کانپ رہا ہے اور میرے بال کھڑے ہو گئے ہیں اور کمان میرے ہاتھ سے نکلی جا رہی ہے۔ میری جلد جل رہی ہے اور میرا دماغ گھوم رہا ہے میں بُرے شگون دیکھ رہا ہوں۔ مجھے اپنے ہی کنبے کے افراد کو قتل کرنے میں کوئی خیر دکھائی نہیں دیتا۔ مجھے فتح کی خواہش نہیں ہے اور نہ ہی میں اقتدار چاہتا ہوں اور نہ نشاط و راحت۔ میں یہ سب نہیں چاہتا میں اپنے بھائیوں کا خون نہیں کرنا چاہتا۔(Muller Vol. III, 1965.40)

ارجن کی بات سُن کر جہاں کرشن جسم اور روح کی بقاء کا فلسفہ پیش کرتا ہے وہاں یہ بھی کہتا ہے ''اے ارجن تو کھشتری ہے دھرم کی خاطر یدھ کرنا تیرا عین دھرم ہے تو اپنا فرض پہچان تمہیں اس وقت بالکل ہچکچانا نہیں چاہئے کیونکہ کھشتری کے لئے دھرم یدھ سے بڑھ کر کوئی عمل اطمینان بخش نہیں ہے اس لئے یدھ (جنگ) میں ڈٹ جا۔''

''اے ارجن اگر تو اس یدھ میں مارا گیا تو سورگ پائے گا، اگر جیت گیا تو زمین پر راج کرے گا، اس لئے لڑنے کا ارادہ کر کے تو کھڑا ہو جا، دونوں ہی صورتوں میں تیری بہتری ہے۔''

پھر کہتا ہے۔ ''دھرم یدھ کرنے والے کے لئے دکھ، سکھ، نفع، نقصان، ہار جیت مساوی ہیں۔ جیت سے وہ پھولتا نہیں اور ہار سے مایوس نہیں ہوتا۔ اُسے ہار جیت سے کوئی سروکار نہیں راستی کے لئے موت آنا اس کے لئے حیات جاوداں ہے۔''

جیسا کہ ظاہر ہے کہ جنگ میں دونوں فریق اپنے اپنے طور پر راستی کے لئے لڑ رہے ہوتے ہیں اس لئے جنگ ناگزیر ہو جاتی ہے اور تاریخ ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ یہاں میں ہندوستان کے دو مورّخین کے حوالے دینا چاہوں گا۔ رومیلا تھاپر (Romilla Thapar) کہتی ہے جہاں رتھ بان کے طور پر کرشن ارجن کو جنگ پر آمادہ کرتا ہے وہاں اگر گوتم بدھ رتھ بان ہوتا تو اُس کا پیغام اُس سے بالکل مختلف ہوتا (Thapar.2002.218)۔ لیکن ڈی ڈی کوسامبی (D.D.Kosambi) کرشن کے لئے خیر کا کوئی کلمہ نہیں نکالتا۔ وہ کہتا ہے کہ اخلاقی اقدار کے حوالے سے کرشن نے کوئی اچھا سبق نہیں دیا۔ پھر کہتا ہے کہ اُس کی تلقین کردہ کسی بھی اخلاقیات پر بمشکل ہی اعتماد پیدا ہو سکتا ہے۔ (Kosambi.1985.206)

میں اس بات پر حیران ہوں کہ کوسامبی تاریخی مادیت کے قریب ہوتے ہوئے بھی کرشن کی اخلاقیات کو سوالیہ نشان بنا رہا ہے۔ میں یہاں صرف اُس حصے کو زیر بحث لا رہا ہوں جو ارجن کے ساتھ جنگ کے بارے میں مکالمے کی شکل میں ہے۔ کرشن کے درس کا یہ حصہ اپنے تاریخی بُعد کو ایک طرف رکھتے ہوئے نیٹشے کے ''Thus Spake Zara Thusta'' اور زرتشت سے کافی مماثلت رکھتا ہے۔

یورپی کلاسیکی ادب کی شاہکار رزمیہ نظم ایلیڈ (Illiad) جو ہومر سے منسوب ہے (یہ الگ بات ہے کہ اُس کے مصنف اور وقت کے بارے میں مختلف آراء پائی جاتی ہیں) اپنے متن کے حوالے سے خونچکاں داستانِ الم ہے۔ ایلیڈ جس کے سادہ الفاظ میں معنی ہیں ٹرائے کے بارے میں شاعری اپنے تئیں خون، قتل گری سطوت اور غم والم سے عبارت ہے۔ (Baldry.1951.51) بظاہر اس نظم میں ایک عورت کے لئے مشرق کے ایک عظیم شہر کو نیست و نابود کر دیتا ہے۔ لیکن سورماؤں کی شجاعت، دلیری اور خون ریزی کی داستان بھی رقم کرتی ہے۔ گو یہ سب کچھ انسانوں نے دیوتاؤں سے منسوب کر دیا۔ لیکن یہ دس سالہ لڑائی، جنگ کی برتری کو مسند پر سجاتی ہے۔ گو یورپڈیز (Euripides) کے ڈرامے

ٹرائے کی عورتیں(Trojan Women) میں نوحہ گری کا عنصر بھی شامل ہے لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ عمومی طور پر یونانی کلاسیکی ادب میں غارت گری اور فتح کو شاندار خراجِ عقیدت پیش کیا گیا ہے۔

قتال کے بارے میں ایلیڈ ہی میں اکلیز (Achilles) اور ہیکٹر (Hector) کے درمیان ہونے والا مکالمہ جنگ کے حق میں تاریخی حقیقت نگاری کی اعلیٰ ترین مثال ہے۔ اکلیز آخری دنوں میں ہیکٹر سے لڑتے ہوئے غضب ناک انداز میں مخاطب ہوتا ہے۔

''ہیکٹر میں تم سے صلح کی کوئی بات نہیں کرنا چاہتا، تم ہر بات کو جلد بھولنے والے ہو۔ کیونکہ شیروں اور انسانوں کے درمیان صلح کی کوئی ایسی روایت موجود نہیں ہے۔

یاد رکھو بھیڑیوں اور بھیڑوں کے درمیان صلح کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ دونوں ہمیشہ ایک دوسرے کے لئے قابلِ نفرت ہیں۔ اس لئے ہمارے درمیان بھی کوئی مفاہمت نہیں ہو سکتی۔ تاوقتیکہ ہم میں سے ایک خاک میں نہیں مل جاتا۔'' (Homer.1984.388)

تھیوسی ڈائیڈس (Thusidides) نے بھی اس بات کی توثیق واضح الفاظ میں کی ہے۔ جب یونانیوں نے جزیرہ میلوس پر چڑھائی کی اور قتل و غارت سے پہلے اہل یونان اور میلوس کے باشندوں کے درمیان بات چیت ہو رہی تھی کہ جنگ کو روکا جا سکے تو یونان کے معتبرین اہل میلوس (Melos) سے یوں گویا ہوئے۔

''آپ اور ہم عملی طور پر یہ جانتے ہیں کہ انصاف کا سوال اُن دو متحارب گروہوں میں ہوتا ہے جو عسکری قوت کے بل بوتے پر ہم پلّہ ہوں اگر ایسا نہ ہو تو طاقت ور وہی کرتا ہے جو وہ چاہتا ہے اور کمزور کو زیر ہونا ہوتا ہے۔''

بالآخر اہل میلوس کے سب جوانوں کو قتل کر دیا گیا اور عورتوں اور بچوں کو غلام بنا لیا گیا۔

(Thucydides.1968.267-273)

فینلے (Finley) کے نزدیک جنگ یونانیوں کی زندگی کا روزمرہ کا معمول تھا۔ حتیٰ کہ افلاطون نے اپنی کتاب قوانین (Laws) کا آغاز ہی اس بات سے کیا ہے۔ وہ کریٹ کے ایک پرانے قانون ساز کی تعریف اس لئے کرتا ہے کہ وہ اپنے معاشرے کو کس طرح جنگ کے لئے تیار رکھتا تھا اور یہ کہ زندگی بھر ایک شہری ریاست کو دوسری شہری ریاستوں کے خلاف نبرد آزما رہنا ہے

اس لئے جنگ یونانیوں کی پالیسی سازی کا حصہ تھی جسے یونانیوں نے بارہا استعمال کیا۔

(Finley.1963.63)

اس سلسلے میں یونان کی مثال اُس کی دوسری ریاستوں بالخصوص سپارٹا کے حوالے سے واضح کرنا ہوگی جس کا آئین ہی شہریوں کو جنگ کے لئے تیار کرنے کے گرد مرتکز تھا۔

یہ آئین لیکرگس کرگس (Lycurgus) سے منسوب ہے ہر شہری کی زندگی کو عسکری تربیت پر استوار کرتا تھا۔

سپارٹا جہاں ڈوریائی (Dorians) نسل کے لوگ آباد تھے شمال سے آ کر انہوں نے جنوبی پیلوپونی سوس (Peloponnesus) پر قبضہ کر لیا تھا۔ ول ڈیورانٹ کہتا ہے کہ شمال سے آئے ہوئے ان لمبے بالوں والے سخت جان پہاڑی باشندوں کا مطمع نظر سوائے جنگ اور غلامی کے کچھ نہ تھا اور یہی زندگی گذارنے کے لئے اُن کے لئے صحیح راستہ تھا۔ یہ بھی کہ یہاں پر بسنے والے زراعت پیشہ پُر امن شہریوں کو زندگی کو آگے بڑھانے کے لئے آقاؤں کی بھی ضرورت تھی۔

یونان میں جہاں بہت سی روایات بھاٹوں کے منہ سے نکل تاریخ دانوں کے قلم سے مستند ہوئیں اُن میں جنگ ٹرائے کو تاریخ کا لبادہ پہنانے کے ساتھ ہیروڈوٹس نے لائی کرگس کی رومانی اساطیری شخصیت کو حقیقت کا روپ دے دیا۔ سپارٹا کی زندگی کے بنیادی ارکان میں جنگی تربیت کو مرکزی حیثیت حاصل تھی، عسکری تربیت ہر شہری کے لئے لازم تھی اور بیس سال کی عمر سے لے کر ساٹھ سال کی عمر تک اُسے فوجی خدمات کے لئے خود کو تیار رکھنا ہوتا تھا۔

سکندر اعظم یونان کے شمال میں مقدونیہ کی چھوٹی سی ریاست سے باہر نکلا۔ گو وہ اصلاً یونانی نہیں تھا۔ پھر بھی اُس کی آبیاری یونان کے مرکزی شہر ایتھنز (Athens) سے ہوئی تھی اور اُسے ارسطو جیسا باکمال اُستاد ملا تھا اور اُس کی افواج یونانی تہذیب وتمدن کو اپنے دوش پر اُٹھائے ہوئے تھیں اس لئے حملہ آور ہونے کے ساتھ ساتھ وہ مفتوحہ علاقوں میں اُس کے اثرات بھی چھوڑتی گئیں۔ سکندر جہاں سے بھی گذرا یونانی تہذیبوں وثقافت کے بیج بوتا گیا۔ ول ڈیورانٹ کہتا ہے کہ اُس کی رگوں میں اپنے باپ فلپ کی طرف سے ملی ہوئی تو اور اولمپیا سے حاصل کی ہوئی وحشیانہ شدت تھی۔ اولمپیائی باشندے اپنا رشتہ اکلیز (Achilles) سے جوڑتے تھے۔ اس کی ماں اولمپیاس کا بھی یہی موقف تھا۔ اس لئے جب ایلیڈ (Illiad) کا وہ شیدائی تھا جب اُس نے

ہیلس پونٹ (Hellespon) کو پار کیا تو اُس کے مطابق وہ اکلیز کے نقش قدم پر چل رہا تھا اور جب وہ ایشیائی ساحلوں پر اُترا تو اُسے محسوس ہوا کہ اُس کے آباواجداد نے جو کام ٹرائے (Troy) سے شروع کیا تھا وہ اُس کی تکمیل کر رہا ہے۔ اپنی تمام مہموں کے دوران وہ ایلیڈ کا وہ نسخہ جسے ارسطو نے تدوین کیا تھا اپنے سرہانے رکھتا تھا جس کے پہلو میں ایک خنجر رکھا ہوتا تھا جو آلہ کار اور منزل کی علامت تھے۔ (Durant.1966.Part.III.538)

پلوٹارک کے کہنے کے مطابق اُسے علم حاصل کرنے کی شدید پیاس تھی۔ وہ مختلف علوم میں دلچسپی رکھتا تھا وہ دن بھر سفر کرنے یا برسرِ پیکار رہنے کے بعد آدھی آدھی رات تک عالموں اور سائنس دانوں سے بحث و مباحثہ کرتا تھا۔ شاید ارسطو کے مشورے سے ہی اُس نے دریائے نیل کے ماخذ اور منبع کو دریافت کرنے کے لئے ایک مہم روانہ کی تھی۔ جو علم جغرافیہ کی طرف ایک بڑا قدم تھا۔

جب ہندوستان آیا تو ٹیکسلا کے قریب ہندوؤں جوگیوں کے ساتھ اُس کے مکالمے تاریخ دانوں نے درج کئے ہیں۔ اس طرح جنگ اپنے لاؤلشکر کے ساتھ جہاں اور بہت سے اثرات لے کر جاتی ہے۔ وہاں علم کے ساتھ ساتھ نسلی ملاپ سے پیدا ہونے والے بچوں کے روپ میں دو تہذیبوں میں مابین ہم آہنگی کو جنم دیتی ہے۔ ایران میں آ کر یونانیوں نے بے شمار ایرانی عورتوں سے بچے پیدا کئے اور اُن کے اختلاط سے ایک نئی نسل پیدا ہوئی۔

یہی حال ہندوستان میں بھی ہوا۔ کہا جاتا ہے اُس نے اپنے ایک بحریہ کے افسر کو تارک الدنیا برہمنوں سے مکالمہ کرنے کے لئے بھیجا۔ جیسا کہ یحییٰ امجد نے لکھا ہے کہ اُس نے دو برہمنوں کو کھانے پر بلایا اور ایک کو بطور فلسفی ملازم بھی رکھ لیا۔ یونانی ان جوگیوں یا برہمنوں کو جمنوسوفسطائیوں (Gymno Sophists) کے نام سے یاد کرتے تھے اُن میں سے سب قابل ذکر کلانوس (Kalanos) تھا جو سکندر کے ساتھ ہی چلا گیا تھا۔ سکندر اُسے عزت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ پلوٹارک کے مطابق اُس کا اصل نام سفینز (Sphines) تھا لیکن یونانی اُسے (Kalanos) کلانوس کے نام سے یاد کرتے تھے۔ آخر میں اُس نے ایران میں سوسا کے مقام پر خود کو جلتی ہوئی چتا کے سپرد کر دیا تھا۔ اسی طرح ایک اور ہندی سوفسطائی کا ذکر ہے جسے مانندانیز (Mandanes) کہا جاتا ہے۔ اس کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ کھلی چراگاہوں میں جن

میں یونانی چلتے تھے تو یہ اُن کے قدموں کے نشانوں پر اپنا پاؤں رکھ دیتے تھے جب سکندر نے یہ پوچھا کہ وہ ایسا کیوں کرتے ہیں تو انہوں نے جواب دیا کہ سکندر تم جو ایک غاصب کے طور پر ہمارے ملک پر قبضہ کرنے آئے ہو مرنے کے بعد تمہیں صرف اتنی ہی جگہ میسر آئے گی۔ جتنی کہ ہر ایک کو ملتی ہے۔[Arrian (VII.I.S.III)]

(Mcrindle.1992.336-337)

اپنی جنگوں مہموں کے درمیان سکندر جہاں کہیں بھی گیا اُس نے وہاں اپنے تئیں نہ صرف سیاسی اور انتظامی تبدیلیاں کیں جو تہذیبی ترقی کی نمائندہ تھیں بلکہ نئے شہر بھی بسائے۔ اکثر شہروں کا نام بھی سکندر کے حوالے سے سکندریہ (Alexendria) رکھا گیا تھا۔

ایک خیال یہ بھی ہے کہ سکندریہ نامی ایک شہر اُس نے افغانستان میں بامیان کے آس پاس بنایا تھا۔ لیکن یہ بھی بتایا جاتا اس کی اصل جگہ باختر جانے والے راستوں کے سنگم پر تھی جو ''چری کر'' گاؤں کے پاس ہے۔ اسی طرح نکایا (Nikaia) کا شہر بھی بگرام کے میدانی علاقے میں بنایا گیا تھا۔ یونانی زبان میں نکایا کا مطلب ہے فاتح (Victorious)۔ مصر کی مشہور بندرگاہ اسکندریہ کی بھی سکندر سے یہی نسبت ہے۔

اپنی تخت نشینی کے بعد اُس نے یونانی ریاستوں کی طرف رخ کیا۔ تھیبس (Thebes) کو زیر کرنے کے بعد وہ ایتھنز پہنچا اور وہاں آ کر آمریت کے خاتمے کا اعلان کیا اور یہ کہا کہ تمام شہر اپنے قوانین کے تحت آزاد زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ وہ علم کا قدردان تھا۔ تھیبس کو تخت و تاراج کرنے سے پہلے اس نے یہ حکم جاری کیا کہ پندار (Pindar) کے گھر کو نقصان نہ پہنچایا جائے۔

بہت سے تاریخ نویس اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ 1789 کا انقلاب تاریخ کا ایسا روشن باب ہے کہ جس میں فرانس کے اُبھرتے ہوئے بورژوا طبقے (Bourgeoise Class) نے باقی پسے ہوئے طبقات کی مدد سے جاگیردارانہ اشرافیہ اور اُس کے (Absolutist) بادشاہ لوئی شانزدہم (Loius XVI) کو اُکھاڑ کر پھینک دیا تھا۔ اس کا فیصلہ ایک جدل کے ذریعے ہوا تھا جہاں اُبھرتے ہوئے نئے پیداواری رشتوں نے اُن عوامل کو جنم دیا جنہوں نے سماج کی کایا پلٹ دی جیسا کہ ہربرٹ مارکوز (Herbert Marcuse) نے کہا ہے کہ فرانسیسی انقلاب کے نظریات نے اپنا مسکن صنعتی سرمایہ داری کی عمل پذیری میں ڈھونڈا۔ (Marcuse.1977.4)

مسلح نئے طبقات نے پرانے فرسودہ نظام کو شکست دی نہ صرف یہ بلکہ پورے یورپ میں اس ارتعاش کو محسوس کیا گیا اور جگہ جگہ زندگی نئی ڈگر پر چل پڑی۔ سکندر کے حملے کے بعد ہمیں یونانی تہذیب کے اثرات ہر خطے میں ملتے ہیں۔ ہمارے ہاں گندھارا تہذیب اُس کی نشانیاں باقی ہیں۔

نپولین کی افواج اور روشن خیالی نے مشرق کی طرف ایسی پیش قدمی کی کہ سماج بدل ڈالا۔ اگر مارکس کے الفاظ میں بیان کروں تو زیادہ بہتر ہوگا۔

سترہویں اور اٹھارہویں صدی میں جو بڑی تبدیلیاں یا انقلابات یورپ میں آئے ان کے بارے میں مارکس کا کہنا ہے۔ ''1648 اور 1789 کے انقلابات فقط برطانوی یا فرانسیسی انقلاب نہ تھے بلکہ وہ یورپی سطح کے انقلاب تھے۔ وہ پرانے سیاسی نظام پر معاشرے کہ کسی ایک طبقے کی فتح کا اعلان نہ تھے بلکہ نئے یورپی معاشرے کے سیاسی نظام کا اعلان تھے۔ ان انقلابوں میں جیت سرمایہ داروں کی ہوئی لیکن اُس وقت سرمایہ داروں کی جیت نئے سماجی نظام کی جیت تھی۔ سرمایہ دارانہ ملکیت کی جیت جاگیردارانہ ملکیت پر قومیت کی جیت صوبائیت پر، مسابقت کی جیت گلڈ (Guild) پر، جائیداد کے بٹوارے کی جیت اولادِ کبریٰ کے حق موروثیت پر، زمین کے مالک کی جیت زمین کے غلبے پر، روشن خیالی کی جیت توہم پرستی پر، خاندان کی جیت خاندان کے نام ونمود پر، کسب وجدوجہد کی جیت سورمائی کاہلی پر، ملکی قانون کی جیت قرون وسطیٰ کی مراعات پر۔ 1648 کا انقلاب سولہویں صدی پر سترہویں صدی کی جیت تھا۔ 1979 کا انقلاب سترہویں صدی پر اٹھارہویں صدی کی جیت تھا۔ یہ انقلابات اپنے عہد کی دنیا کی ضرورتوں کا اظہار تھے نہ کہ اُن علاقوں ___ برطانیہ اور فرانس کی ضرورتوں کا اظہار، جہاں وہ برپا ہوئے تھے۔

(Marx and Engels 1973, Vol. I, 139-140)

فرانس میں جو تبدیلیاں آئیں وہ تو آئیں لیکن میں یہاں خصوصی طور پر جرمن ریاستوں میں آنے والی تبدیلیوں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ جیسا کہ ظاہر ہے کہ جرمنی اُس وقت معاشی ترقی میں فرانس اور انگلینڈ سے بہت پیچھے تھا۔ سیاسی تقسیم کے حوالے سے 350 چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹا ہوا تھا اگر کوئی درمیانہ یا بورژوا طبقہ تھا بھی تو بکھرا ہوا تھا اُن میں ہم آہنگی کا فقدان تھا۔ مختلف علاقوں میں مختلف معاشی معیار اور نظام لاگو تھے۔ محصول اور جنگی کے مختلف نرخ اور شرح ہر جگہ

تجارت میں مختلف انداز میں رکاوٹ کا باعث تھے۔ ہیگل، جسے اختیار (Freedom) کہا ہے وہ عمومی طور پر وہاں کے باشندوں کو حاصل نہ تھا۔ شخصی آزادی کا وہ دور یعنی محنت کو بیچنے کا اختیار صرف صنعتی دور سے شروع ہوتا ہے اور سرمایہ دارانہ دور میں یہ محنت جنس (Commodity) کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔

نپولین کی جرمنی پر یلغار کے بعد وہاں عقل پرستوں اور خردافروزوں نے نپولین کے ساتھ آنے والی تبدیلیوں کو خوش آمدید کہا۔ عقل کے بارے ان ترجیحات نے خردمندی کے تحت اختیار کو استعمال کرنے اور مادی روپ کو بہتر بنانے کے رویئے کو جنم دیا اور جب یہ سب رویئے مادی روپ میں ڈھلے تو جرمن ریاستوں کا منفرد پن اور علاقائی پن ڈھیلے پڑ گئے اور قومی ریاست کی طرف سفر شروع ہو گیا۔ جو ایک نئے اختیار کی طرف پہلا قدم تھا اور دنیا نے دیکھا کہ جرمنی ایک قومی ریاست کے طور پر اُبھرنا شروع ہو گیا۔

تاریخ کا یہ سب سے بڑا انقلاب صرف اُس جنگ کی وجہ سے آیا جو فرانس کے مختلف طبقات کے مابین ہوئی اور بعد ازاں نپولین اُسے یورپ کی دوسری سرحدوں تک لے گیا۔ یہاں یہ بات زور دے کر کہنا چاہتا ہوں کہ جرمنی میں جو سیاسی تبدیلیاں رونما ہوئیں اُس سے پہلے جرمن فکر فرانسیسی مفکروں اور انقلاب کے زیر اثر آ گیا تھا۔ ڈیکارٹ (Descartes) تو ایک طرف ہیگل جیسا عظیم فلسفی اولین دور میں روبز پیر (Robespierre) کے خیالات سے بھی متاثر تھا۔

روبز پیر نے کہا تھا کہ اپنی قوت کے بل بوتے پر عقل کی سماجی نامعقولیت پر فتح ہو گی اور دنیا کے ظالموں کو اکھاڑ پھینکے گی پھر سچ کے سامنے تمام جھوٹ غائب ہو جائے گا اور عقل کے سامنے تمام بے عقلی دم توڑ دے گی۔ ہیگل بھی اُس کی طرح عقل کی ناقابل تسخیر قوت پر یقین رکھتا تھا۔ ہیگل نے اس کے تتبع میں کہا یہ خصوصیت جسے انسان نے خود اپنا کہا ہے انحطاط پذیری اور موت سے ماوراء ہے۔ یہ خود اپنے فیصلے کرنے پر قادر ہے یہ خود کو عقل کہتی ہے۔ یہ اپنے قانون خود وضع کرتی ہے یہ زمین اور آسمان میں کسی خارجی مقتدرہ ادارے سے کچھ حاصل نہیں کرتی۔ (Marcuse.1977.4.5)

ہیگل نے اپنی شہرہ آفاق کتاب ''فلسفہء تاریخ'' میں جن تاریخ ساز شخصیتوں کا ذکر کیا ہے وہ سب اعلیٰ پائے کے عسکری دماغ تھے جو جنگ کو اپنے علاقوں سے لے کر دوسرے ملکوں تک

لے گئے اور ساتھ ایک بہتر تہذیب کے بہترین رنگ بھی اُن میں بکھیر گئے۔ اُن میں وہ سکندر، جولیس سیزر اور نپولین کا نام لیتا ہے۔ جن کی فوجوں کے ساتھ یونان، روم اور فرانس کا تہذیبی ورثہ بھی اُن کے ساتھ گیا۔ مشرق وسطیٰ اور ہندوستان کی تاریخ پر ان جنگوں تاریخ ساز شخصیات کے جو اثرات مرتب ہوئے وہ کسی سے پنہاں نہیں ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ جنگ اور تاریخ کے درمیان جو رشتہ ہے اُس کو زیادہ واضح طور پر پیش کرنے میں، میں نے جو حوالے دیئے ہیں وہ اس بات کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں کہ جنگ اپنی محرکات کی وجہ سے تاریخ پر نہ صرف گہرے اثرات چھوڑتی ہے بلکہ اُس کو آگے بڑھانے میں مدد ومعاون ثابت ہوتی۔

طاقت اور جنگ کے بارے میں بعدازاں جرمن فلسفی (Nietzsche) نیٹشے نے جو اضافے کئے اِن پر مباحث کے کئی نئے باب کھل سکتے ہیں۔ لیکن یہاں میں صرف پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے بعد دنیا بھر میں جو جغرافیائی، انتظامی اور سیاسی تبدیلیاں ہوئیں صرف اُن کی طرف قارئین کی توجہ مبذول کروانا چاہوں گا جو جدید تاریخ کا شاندار باب ہیں اُن لوگوں کی یادداشت میں محفوظ ہیں۔

آخر میں جنگ تاریخ پر جو اثرات مرتب کرتی ہے چند نقاط میں اُس کا مختصر ذکر کرنا مناسب سمجھتا ہوں:

1- تاریخ کے مطالعے سے میں نے یہ اخذ کیا ہے کہ دنیا بھر کی تاریخ طاقت اور جنگ سے عبارت ہے اور یہی بات تاریخ کے صفحات پر چھائی رہی ہے۔

2- لیکن اس طاقت اور جنگ کو کسی نظام کا روپ دینے یا اُس میں ڈھالنے کے لئے دساتیر یا آئین بھی متوازی سطح پر مرتب کئے گئے جو ان کو باعمل اور بامعنی بنانے کے لئے تھے۔

3- جہاں ہم اکلیز، ایگامیمون، سکندر، جولیس سیزر، اٹیلا، کرشن، اندر، چنگیز خان، امیر تیمور اور نپولین کی کہانی دھراتے ہیں تو ساتھ ساتھ ہم حمورابی، تھیسیس (Thesus) سولن، چنگیز خانی یاسا اور اگسٹس نپولین کے تغیرات کی بات کرتے ہیں جو اُن کو استحکام بخشنے اور سہارا دینے کے لئے بنائے گئے تھے۔

4- یہ بات نہیں ہے کہ جنگ کہیں خلا سے اتری تھی۔ بلکہ خوراک، رہائش اور جنس کی ضرورتیں پورا کرنے کے لئے بروئے کار لائی گئی تھی، اور آج بھی ایسا ہی ہے۔

آج زندگی کا پہیہ گھمانے کے لئے جن اشیاء کی ضرورت ہے اُن کے حصول کے لئے دنیا کے مختلف حصوں میں جنگ جاری رکھی جا رہی ہے۔ ہم اُن جنگوں کو کتنے ہی نظریات کا لبادہ کیوں نہ پہنائیں یا پھر اخلاقی ڈھالوں کا سہارا لیں۔ بات اُن تین بنیادی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے مسلط کی جاتی ہے اور تاریخ کے زیادہ تر ادوار میں اسی کا سورج چمکتا ہے۔

Bibliography

1. Hegel, W. F., Hegel's Science of Logic, George Allen and Unwin London 1976.
2. Thilly, Frank., A History of Philosophy, Henery Holt and Company N.Y. 1922.
3. Homer., Illiad, Oxford University Press London, 1984.
4. Thucydides., The History of the Peloponnesian War Oxford London, 1968.
5. M'crvidle, J. W., The Invasion of India Indus Publications Karachi, 1992.
6. Marcuse, Herbert., Reason and Revolution Routledge and Kegom Paul, 1977.
7. Marx and Engels., Selected Works Volume I, Moscow, 1973.
8. Thapar, Romilla., A History of India Vol. I, Penguin Books, New Delhi, 1966.
9. Kosambi, D. D., The Culture and Civilization of India Viskas, Delhi, 1985.

10. Baldry, H. C., Greek Literature Cambridge University Press London, 1951.

11. Finley, M. L., The Ancient Greeks Penguin Book New York, 1984.

☆☆☆

جنگ اور تاریخ

ڈاکٹر مبارک علی

شاید اس واقعہ کا تعلق تاریخ سے نہ ہو، اور اسے محض تفریح کی خاطر گھڑ لیا گیا ہو، مگر اس واقعہ میں ایک سبق موجود ہے، جو ہمیں جنگ اور جنگ سے ہونے والے نتائج کے بارے میں آگہی دیتا ہے۔

واقعہ کی ابتداء اس سے ہوتی ہے کہ ہارون الرشید کے دربار میں ابودلامہ نامی ایک مسخرہ تھا جو خلیفہ کے بہت قریب تھا، اور اس کا پسندیدہ مصاحب تھا، درباری کلچر میں یہ بات مصاحبوں اور امراء کو ناپسند ہوتی ہے، اس لئے وہ اس موقعے کی تلاش میں تھے کہ کسی طرح سے اسے خلیفہ کی نگاہوں میں ذلیل کیا جائے اور اس کی عزت کو خاک میں ملا دیا جائے۔ یہ موقعہ انہیں اس وقت مل گیا کہ جب خلیفہ کسی مہم پر گیا میدانِ جنگ میں دونوں فوجیں آمنے سامنے تھیں، روایت کے مطابق مخالف فوج سے ایک مسلح شخص میدان میں آیا اور اس نے ہارون کی فوج کو چیلنج کیا۔ دستور یہ تھا کہ دونوں فوجوں کے دو افراد میں مقابلہ ہوتا تھا، اس کے بعد عام جنگ ہوتی تھی۔ اس مقابلے میں ہارنے والا اپنی فوج کے لئے باعثِ شرم ہوتا تھا، اور اس کی شکست کو نیک شگون کے طور پر نہیں لیا جاتا تھا۔

جب مخالف کی جانب سے ایک تجربہ کار فوجی کو بھیجا گیا، تو ہارون کے مصاحبین نے کہا کہ اس کا مقابلہ کرنے کے لئے ابودلامہ کو بھیجا جائے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ وہ اس مقابلہ میں نہ صرف

شکست کھائے بلکہ مارا بھی جائے۔ جب خلیفہ نے اس کو مقابلہ کے لئے جانے کو کہا، تو اس کے لئے انکار کی گنجائش نہیں تھی، وہ گھوڑا دوڑاتا ہوا دونوں فوجوں کے درمیان میں گیا کہ جہاں مخالف فوجی اس کا انتظار کر رہا تھا۔ ابودلامہ نے اس سے مخاطب ہو کر کہا کہ اس سے پہلے کہ ہم مقابلہ کریں، میں تم سے کچھ سوالات پوچھنا چاہتا ہوں۔

مخالف فوجی نے حیران ہو کر کہا کہ پوچھو کیا سوالات ہیں؟

ابودلامہ نے کہا کہ کیا تم مجھے جانتے ہو؟

اس نے کہا ''نہیں۔''

ابودلامہ نے دوسرا سوال پوچھا ''کیا تمہاری مجھ سے کوئی دشمنی ہے؟''

اس نے جواب میں کہا ''نہیں۔''

کیا تمہارے اور میرے خاندان کے درمیان کوئی عداوت ہے؟

اس نے کہا ''نہیں۔''

اس پر ابودلامہ نے کہا کہ پھر ہم کیوں ایک دوسرے کو قتل کرنے کے درپے ہیں؟ میں اپنے ساتھ کچھ کھانا لایا ہوں آؤ ہم دونوں مل کر یہ کھانا کھائیں اور دونوں مل کر کھانا کھانے لگے۔

کھانے کے بعد ابودلامہ اس سے رخصت ہوا اور واپس آ کر خلیفہ سے کہا کہ میں اپنا فرض پورا کر آیا؟ اب آپ جنگ کریں، یا صلح۔

تاریخ میں جنگ کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے، جنگ جو اور فاتحین، ہیروز کا درجہ حاصل کر لیتے ہیں۔ ان کی داستانیں اس قدر مقبول ہو جاتی ہیں کہ لوگ انہیں بار بار سنتے ہیں، اور ان ہیروز کی یاد میں مگن ہو جاتے ہیں۔ شاعروں نے ان جنگ جوؤں کی داستانوں کو طویل رزمیہ نظموں میں لکھا، جو سننے والوں کے لئے تفریح کا باعث ہو جاتی ہیں۔ یہ رزمیہ داستانیں چاہے ہومر کی ای لیڈ (Elliad) یا اوڈیسی (Odessy) میں ہوں یا مہابھارت میں، ان میں جنگ اور جنگجو، اس طرح سے ابھرتے ہیں کہ سننے والا ان کی بہادری، قوت اور شجاعت کا دلدادہ ہو جاتا ہے۔

کیا وجہ ہے کہ جنگ کو انسانی تاریخ میں اس قدر اہمیت دی گئی ہے؟ جب کہ یہ ایک وحشیانہ اور دہشت ناک عمل ہے۔ جنگ میں فوجیوں کا جوش وخروش کے ساتھ ایک دوسرے کا قتل، جب کہ وہ نہ تو انہیں پہچانتے تھے، اور نہ ہی ان کی دشمنی تھی۔ اگر ہم ذرا اپنے تخیل کی مدد سے میدانِ جنگ کا نقشہ ذہن میں لے آئیں، تو جنگ کے خاتمہ پر قتل شدہ، اور مسخ شدہ لاشوں کو خون میں تھڑا ہوا دیکھتے ہیں، زخمیوں کی آہ و بکا سنتے ہیں، ایسے میں فتح مند جشن منا رہے ہوتے ہیں، اور شکست خوردہ جو زندہ رہ گئے تھے، وہ مایوسی اور یاس کی تصویر بنے ہوتے ہیں۔

قدیم زمانے میں جنگ کے یہ نقشے بار بار دھرائے جاتے رہے، مگر اس سے کسی نے سبق نہیں سیکھا، سوائے اشوک کے، کہ جس نے جنگِ کلنگ میں جو دلخراش مناظر دیکھے اور اسے یہ احساس ہوا کہ اس کے نتیجہ میں کتنی عورتیں بیوہ ہوئی ہیں، کتنے بچے یتیم ہوئے ہیں اور کتنے خاندان اجڑے ہیں۔ لہٰذا اس کے بعد اس نے دوبارہ جنگ نہیں کی۔

مگر اس کے برعکس وہ حکمران گذرے ہیں کہ جنہوں نے توسیع سلطنت اور اپنی عظمت کے لئے بار بار جنگیں کیں اور ان میں نوجوانوں کی زندگیوں کی قربانی لی۔

اگر آج ہم غور کریں کہ انسانی تاریخ میں کتنی بڑی تعداد ان لوگوں کی ہے کہ جنہوں نے عین جوانی میں ان جنگوں میں جانیں دیدیں، اور اس دنیا سے لطف اندوز ہونے کا انہیں کوئی موقع نہیں ملا۔

کسی ہندوستانی فلسفی نے کہا تھا کہ کسی بھی فرد کا سب سے بڑا بنیادی حق یہ ہے کہ وہ فطری موت مرے، ___ ان جنگوں نے افراد کو اس بنیادی حق سے محروم رکھا اور انہیں اپنی عظمت، عزت یا وقار کی خاطر قربان کر دیا۔

جب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر لوگ کیوں ایک دوسرے کو قتل کرنے کے درپے ہوتے ہیں؟ وہ کیا وجوہات ہیں کہ حکومتوں کو آسانی کے ساتھ جنگ جو مل جاتے ہیں؟ اس سوال کا جواب ان روایات میں ہے کہ جن کے اردگرد معاشرے میں جنگ کے بارے میں تصورات کو

مقبول بنایا گیا۔

جنگ کو ایک پیشے کے طور پر لیا گیا کہ جس کے لئے ضروری تھا کہ اس کو اپنانے والا بہادر، نڈر اور جرأت مند ہو۔ ایسے افراد کی معاشرے میں عزت تھی۔ جنگ میں ثابت قدم رہنے کے لئے یہ روایات تشکیل پائیں کہ وار سینے پر سہنا چاہئے، پیٹھ پہ نہیں، یعنی مقابلہ کرنا چاہئے، بھاگنا نہیں چاہئے۔ جو جنگ میں مارے جاتے تھے، انہیں شہید کا درجہ دیا گیا، اور جو فاتح رہے وہ غازی کہلائے، شہیدوں کی یاد میں یادگاریں تعمیر کرائی گئیں تاکہ ان کو دیکھ کر دوسروں کو بھی اس مرتبہ پر فائز ہونے کا شوق ہو۔ ان کی شجاعت کی داستانیں مقبول ہوئیں اور انہیں معاشرے میں ہیروز کا درجہ دیا گیا۔ جنگ سے فرار بزدلی قرار پائی۔ میدان جنگ میں عزت کی خاطر جان دینا، قابل احترام ٹھہرا۔ اس کی مثال ابوالفضل، مصنف اکبرنامے کی ہے۔ دکن سے واپسی پر اسے اطلاع دی گئی کہ جہاں گیر نے سازش کے تحت راستے میں ایک راجپوت سردار کو اس پر حملہ کرنے کے لئے تیار کیا ہے۔ اس کے مصاحبوں نے اس سے کہا کہ وہ راستہ بدل کر آگرہ چلا جائے، مگر اس نے انکار کر دیا۔ کیونکہ یہ اس کے نزدیک بزدلی کی علامت تھی، وہ اس طے شدہ راستہ پر گیا، اور لڑائی میں لڑتا ہوا مارا گیا۔ اگر وہ راستہ بدل لیتا اور محفوظ آگرہ چلا جاتا تو اس پر بزدلی کے طعنے دیئے جاتے۔ اس لئے اپنی زندگی سے موت کو بہتر تصور کیا جانے لگا۔

عزت و وقار کا یہ تصور افراد کو مجبور کرتا تھا کہ وہ جنگ کو بطور ڈھال استعمال کریں، اور مذہب کی خاطر اپنی جان قربان کر دیں۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ روایات میں اس قدر توانائی اور جان ہوتی ہے کہ فرد ان کے سامنے بے بس ہو جاتا ہے۔ وہ مجبور ہو جاتا ہے کہ روایات کی پابندی کرے، ان سے روگردانی نہیں کرے۔

جنگ کو درست اور صحیح ثابت کرنے کے لئے ہمیشہ کسی نہ کسی جواز کی ضرورت ہوتی ہے۔ کبھی اس کو شخصی وفاداری کے طور پر لیا جاتا ہے کہ جب جنگ اس لئے لڑی جاتی تھی کہ یہ حکمران کے مفاد

میں تھا۔ عام فوجی اس کی وفاداری کا اظہار کرتے ہوئے، اس کے منصوبوں کو پورا کرنے کے لئے جنگ پر آمادہ ہو جاتے تھے۔

جنگ کو مذہب کے نام پر تقدس کا درجہ دیا جاتا تھا، اور اس جذبہ کو ابھارا جاتا تھا کہ دوسرے لوگ گمراہ ہیں، لہٰذا انہیں راہ راست پر لانے کے لئے یا تو انہیں جنگ کے ذریعہ مجبور کیا جائے کہ وہ ان کا مذہب اختیار کر لیں، یا انہیں قتل کر دیا جائے تا کہ دنیا سے گمراہی کا خاتمہ ہو۔

مذہب کے اس جذبہ کے ساتھ ساتھ قوم پرستی کے جذبات کو ابھارا گیا اور جنگ اور فتح کو قوم کی عظمت کا ذریعہ بنایا گیا لہٰذا ہر نظریہ کے پس منظر میں یہ جذبہ کارفرما تھا کہ مخالف کے لئے نفرت وحقارت اور دشمنی پیدا ہوتا کہ ان کے ساتھ جنگ کرنے اور انہیں قتل کرنے میں کوئی ہمدردی یا نرمی نہ ہو۔ ان کو تہذیب اور غیر متمدن کے درمیان مقابلہ کا نام دیا گیا۔

لہٰذا جب جنگ ان نظریات کی بنیاد پر ہوں تو اس کو درست اور قابل احترام ٹھہرا دیا گیا، اور لوگوں میں احساسِ جرم مفقود ہو گیا۔

جنگ میں فاتح اپنی کامیابی کے بعد اس کو حق سمجھتا تھا کہ شکست خوردہ قوم یا ملک کے خزانوں اور ان کے ذرائع پر قبضہ کر کے انہیں مال غنیمت کا درجہ دیدے۔ مال غنیمت فاتح کے لئے جائز ہو جاتا تھا، اس میں صرف مالی وفطری ذرائع ہی نہیں ہوتے تھے بلکہ شکست خوردہ قوم کی عورتیں اور بچے بھی مال غنیمت میں شمار ہوتے تھے۔ اس لئے جنگ ایک طرح سے دوسروں کے مال پر قبضہ کرنے اور انہیں استعمال کرنے کا ایک ذریعہ تھی۔

فتح یاب افواج، اپنی فتح کے اظہار کے طور پر شہروں کو جلانا، عمارتوں کو مسمار کرنا، کھیتوں اور بازاروں کو تباہ کرنا بھی ضروری سمجھتے تھے، تا کہ ان کا ڈر اور خوف لوگوں کے دلوں میں باقی رہے۔

جنگ اخلاقی اقدار کے تصور کو بھی بدل دیتی تھی مثلاً جب دو حریفوں کے درمیان جنگیں طویل عرصہ تک رہیں، اور دونوں جانب سے ایک دوسرے کے خلاف قتل وغارت گری رہی، تو یہ لوگوں کے جذبات کو بدل دیتی تھی، مثلاً ٹروئے (Troy) کی جنگ میں فتح کے بعد جب

سوال آیا کہ کیا اس شہر کی عورتوں اور بچوں کو قتل کرنا چاہئے تو یونانی جنرل ایگ میم ئون (Ig Memnon) نے دلیل دی کہ انہوں نے ہماری عورتوں اور بچوں کو قتل کیا ہے، لہٰذا یہ انصاف ہے کہ ہم اس کے بدلے میں ان کی عورتوں اور بچوں کو قتل کریں۔

جنگ کے بارے میں اب تک جو تصورات ہیں ان کو تبدیل کرنے کی ضرورت ہے۔ ان فاتحین کو کہ جن پر قومیں فخر کرتی ہیں، اور جنہیں ہیروز کا درجہ دیا جاتا ہے، اب انہیں مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا کرنے کی ضرورت ہے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تاریخ میں جن اقوام نے جنگوں کے ذریعہ جرائم کا ارتکاب کیا ہے، انہیں احساس جرم ہونا چاہئے۔ جیسا کہ ہم نے دیکھا اشوک کو اس کا احساس ہوا اور اس نے جنگ کو چھوڑ کر عدم تشدد کے راستے کو اختیار کیا۔ موجودہ دور میں جرمنی کو ضرور دوسری جنگ عظیم کے بعد ''احساسِ جرم'' ہوا۔

یہ احساسِ جرم نہ تو کولونیل طاقتوں کو ہے کہ جنہوں نے ایشیا و افریقہ کے ملکوں کو اپنی کالونی بنایا، ان کے ذرائع کو لوٹا، ان کی تہذیب و معاشرے کو تباہ و برباد کیا، اور اپنے اقتدار کے استحکام کے لئے لوگوں کا قتل عام کیا اس کے برعکس، ان میں یہ احساس ہے کہ انہوں نے نوآبادیات کو مہذب بنایا اور انہیں جدید دور سے روشناس کرایا۔

جب تک قوموں میں احساسِ جرم نہیں ہوگا، اور اس احساس کے پیدا ہونے میں قومی عظمت، مذہب اور قومی فخر قائم رہے گا، اس وقت تک جنگیں بھی ہوتی رہیں گی، اور جنگی ہیروز بھی پیدا ہوتے رہیں گے۔

عام طور سے جنگ کے بعد کے نتائج پر زیادہ غور نہیں کیا جاتا ہے۔ اس میں مرنے والوں کی تعداد کا تو ذکر ہوتا ہے، مگر زخمی اور معذور ہونے والوں کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں ہوتی ہیں کہ اس صورت میں ان کی زندگی کیسے گذرتی ہے اور وہ کن مشکلات کا شکار ہوتے ہیں۔

جنگ کے بارے میں تاریخ سے تاثر ابھرتا ہے کہ یہ مسئلہ کا حل ہے۔ اس وجہ سے ہماری زبان میں جنگ کو اسی مفہوم میں استعمال کرتے ہیں۔ جیسے غریبی کے خلاف جنگ، بدعنوانی کے

خلاف جنگ، انسانی حقوق کے لئے جنگ، عورتوں کی آزادی کی جنگ، لہٰذا جنگ اپنے مفہوم اور عمل میں مقبولیت حاصل کر لیتی ہے۔

یہاں تک کہ ہمارے شاعروں نے محبوب کو قاتل بنا کر اس کی ابرو کو کمان اور اس کی نظروں کو تیر بنا کر کشتوں کے پشتے لگا دیئے۔

اس لئے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا دو قوموں کے درمیان بغیر جنگ کے مسائل کا تصفیہ ہو سکتا ہے یا نہیں؟ تاریخ میں جب کبھی طاقت ور اور کمزور کے درمیان جھگڑا ہو تو طاقت ور اس کا حل جنگ میں ڈھونڈتا ہے۔ اس کی مثال کارتھیج کے جنرل ہنی بال اور رومی جنرل سسی پیو افریکانس کے درمیان ہونے والی جنگ ہے۔ ہنی بال اس وقت کمزور تھا اور جنگ کے بجائے پُر امن طریقے سے مسائل کا حل چاہتا تھا، اس لئے اس نے رومی جنرل سے ملاقات کی اور امن کی پیش کش کی۔ رومی جنرل کو اپنی طاقت کا احساس تھا، اس لئے اس نے کہا کہ یا تو اس کی شرائط کو تسلیم کر لیا جائے ورنہ جنگ کے ذریعہ وہ اپنی بات تسلیم کرائے گا، اور یوں بالآخر جنگ ہوئی اور کارتھیج کو اس میں شکست ہوئی۔ اگر چہ رومیوں نے اپنی شرائط منوالیں۔ مگر دونوں جانب سے ہزاروں لوگ مارے گئے اور زخمی ہوئے، ان عام لوگوں کی زندگی دو طاقتوں کے جھگڑے میں ختم ہوگی اور ان پر ماتم کرنے والا کوئی نہیں تھا، انہیں کی لاشوں پر فتح کے جشن منائے گئے اور رومی جنرل کو عظیم قرار دیدیا گیا۔

روایتی تاریخ کا المیہ یہ ہے کہ جب یہ قوموں کا عروج و زوال کے بارے میں بیان کرتی ہے تو اس میں عروج کو قوم کی فتوحات کے ذریعہ دیکھا جاتا ہے۔ اس کا زوال اس وقت ہوتا ہے کہ جب اس کی فتوحات کا پہیہ رک جاتا ہے اور وہ دوسری قوموں سے شکست کھانے لگتی ہے۔ قوموں کے علم و ادب یا سائنسی کارناموں کا ذکر نہیں ہوتا ہے۔ جنگ اور جنرلوں کی زیادہ اہمیت ہوتی ہے۔ اسکالرز پس پشت چلے جاتے ہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر جنگ کی تباہ کاریوں کے باوجود لوگ اس سے نفرت کیوں نہیں کرتے، اور اسے مقدس اور معتبر سمجھتے ہیں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ جنگ مذہبی اور قوم پرستی

کے جذبات کو ابھارتی ہے۔ یہ جذبات اسے حق اور تقدس کا درجہ دیدیتے ہیں۔ اس میں مرنے والے شہید ہو جاتے ہیں، اور زندہ رہنے والے غازی۔ معاشرے میں شہید اور غازی دونوں کا سماجی مرتبہ برابر ہوتا ہے۔ اس وجہ سے جنگ میں فتح ہو یا شکست وہ مذہبیت اور قوم پرستی کے جذبات کو ابھارتی ہے۔ لہٰذا اگر جنگ کی مخالفت کی جائے تو یہ مذہب اور وطن سے غداری تصور کی جاتی ہے۔

اگر چہ انسان ماضی میں جنگ کی خوں ریزی سے دوچار رہا۔ زمانہ حال میں جنگوں نے پہلے سے زیادہ تباہی و بربادی کی۔ مگر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جنگ انسان کی فطرت سے جڑی رہے گی۔ قومیں اپنی فوجی طاقت وقوت اور اسلحہ پر ناز اور فخر کرتی ہیں۔ اس کی خاطر وہ عوام کی فلاح و بہبود کو بھی نظر انداز کر دیتی ہیں، لہٰذا اس صورت حال میں جنگ کے خطرات منڈلاتے رہیں گے۔

پہلی جنگ عظیم نے یورپ کے لوگوں میں زبردست ردِعمل کو پیدا کیا، کیونکہ یہ جنگ دوسری جنگوں سے مختلف تھی۔ اس میں جو ہتھیار استعمال ہوئے وہ زیادہ تباہ کن اور مہلک تھے۔ پہلی مرتبہ اس جنگ میں ٹینک، شیل، مشین گن اور دوسرے مہلک ہتھیاروں کا استعمال ہوا۔ اس جنگ میں خندقوں کا بھی استعمال ہوا کہ جہاں فوجی کیچڑ، ریت اور زندگی کی سہولتوں سے محروم دشمن کے خلاف آمنے سامنے لڑ رہے تھے۔ یہ جنگ اس وجہ سے بھی عظیم کہلائی کیونکہ یہ یورپ، ایشیا اور افریقہ میں لڑی گئی۔

مہلک ہتھیاروں کے استعمال کی وجہ سے اس جنگ میں مرنے والوں کی تعداد بہت زیادہ تھی، جس نے یورپ کے لوگوں کو سخت متاثر کیا۔ اس لئے جب جنگ ختم ہوتی ہے تو اس نے اہلِ یورپ کے خیالات میں سخت تبدیلی پیدا کی۔ اول، اب تک اہلِ یورپ سائنس اور ٹکنالوجی میں ترقی کر رہے تھے، اور اس ترقی کی وجہ سے ان کا خیال تھا کہ وہ بغیر کسی رکاوٹ کے برابر آگے بڑھتے رہیں گے، مگر اس جنگ نے ترقی کے اس نظریہ کو سخت دھچکہ لگایا۔

لہٰذا جنگ کے بعد یورپ کے دانشوروں میں زندگی کے بارے میں سخت مایوس کن خیالات

پیدا ہوئے، مثلاً آرٹ میں ڈاڈازم (Dadaism) اور (Surealism) کی تحریکیں پیدا ہوئیں کہ جن میں آرٹ کے ذریعہ اس کا اظہار ہوا کہ زندگی بے معنی اور بے مقصد ہے۔ ادب میں ناولوں اور شاعری کے ذریعہ اس بے معنویت کا اظہار کیا گیا۔ فرانس میں بننے والی ایک فلم میں یہ بتایا گیا کہ جنگ میں مرنے والے فوجی ایک رات واپس اپنے گاؤں اور شہروں میں آتے ہیں، اور دیکھتے ہیں کہ زندگی اسی طرح سے جاری ہے، لوگ خوشی و مسرت سے گا رہے ہیں، رقص کر رہے ہیں، ان کی بیویاں دوسرے مردوں کے ساتھ ہیں، یہ سب دیکھ کر وہ کہتے ہیں کہ آخر ہم نے کیوں جان دی، اس کا کیا مقصد تھا؟ اور ہمیں اس کا کیا صلہ ملا؟

لیکن جنگ سے نفرت اور ردِ عمل یورپ کو دوسری جنگ عظیم سے نہیں روک سکی، جو پہلی سے بھی زیادہ تباہ کن اور مہلک تھی۔

اگر چہ جنگیں تباہی لے کر آتی ہیں، مگر ان کے بلا واسطہ مثبت اثرات بھی ہوتے ہیں۔ پہلی جنگ عظیم کے نتیجہ میں تین بڑی سلطنتیں ٹوٹیں روس، آسٹریا ہنگری، اور عثمانی۔ اس جنگ کی وجہ سے روس میں کمیونسٹ انقلاب کامیاب ہو سکا۔

دوسری جنگ عظیم میں جب جاپان نے چین پر حملہ کیا تو اس کے نتیجہ میں قوم پرست اور کمیونسٹ متحد ہو گئے اور جاپان کے خلاف اپنے ملک کا دفاع کیا۔ اس نے کمیونسٹ پارٹی کو موقع دیا کہ جنگ کے بعد قوم پرستوں کو شکست دے کر انقلاب لائے۔ انقلاب کے بعد جاپان کے وزیر اعظم نے چین کا دورہ کرتے ہوئے اس امر پر معافی مانگی کہ ان کے ملک نے چین پر حملہ کر کے زیادتی کی تھی، تو چو۔ این۔ لائی نے کہا کہ معافی کی ضرورت نہیں، اگر آپ اس وقت حملہ نہیں کرتے تو ہم اب تک غاروں میں رہ رہے ہوتے۔ ان کا اشارہ اس جانب تھا کہ اس صورت میں قوم پرست انہیں آگے بڑھنے کا موقع نہیں دیتے، اور لانگ مارچ کے بعد قوم پرست فوجوں کی پہنچ سے دور غاروں میں پناہ لئے رہتے۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد اہلِ یورپ نے تو خود کو جنگوں سے علیحدہ کر لیا ہے، اور جنگ

لڑنے کا کام امریکہ کو دیدیا ہے۔ ویت نام کی جنگ میں امریکہ کو شکست کا سامنا کرنا پڑا، مگر اس نے اپنے سامراجی عزائم کے لئے جنگ کا سہارا لیا، اور عراق و افغانستان کی جنگوں میں الجھ کر رہ گیا ہے۔

اگرچہ یورپ اور امریکہ میں ان جنگوں کے خلاف سخت ردِعمل ہے، مگر سیاست داں، اور اسلحہ کے تاجران جنگوں کو جاری رکھے ہوئے ہیں، اس کے علاوہ اسرائیل اور فلسطین کے درمیان جنگوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ جاری ہے۔ افریقہ کے ملکوں میں خانہ جنگیاں بھی ہیں، تو ایک دوسرے کے خلاف جنگ کو فیصلہ کے طور پر اختیار کیا جا رہا ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کئی بار جنگوں کے باوجود پُر امن طور پر مسائل کے حل کے لئے تیار نہیں۔

اس لئے یہ سوال اہم ہے کہ کیا مستقبل میں جنگوں کو روکا جا سکے گا یا یہ جنگیں کسی نہ کسی سطح پر جاری رہیں گی؟

☆☆☆

جنگ اور ادب

پروفیسر سحر انصاری

انسانی تاریخ اپنی دستاویزی شکل میں تو انسانی تمدن کے ارتقائی مراحل سے گزرتے ہوئے بہت بعد میں دستیاب ہوتی ہے لیکن معلومہ تاریخ تک دسترس حاصل کرنے کے کئی ذرائع انسان نے دریافت کر لیے ہیں اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ ان میں آثارِ قدیمہ اور بشریاتی مآخذ (anthropological sources) بھی شامل ہیں اور وہ مآخذ بھی جو ضبطِ تحریر میں آ چکے ہیں۔

جنگ انسانی سماج کا ایک ناگزیر حصہ رہی ہے اور ہمیں ادب کے جو قدیم شاہ پارے ملتے ہیں ان کی بنیاد بعض اہم جنگوں پر ہی رہی ہے۔ جیسے قدیم ہندوستان میں مہابھارت اور رامائن۔ مہابھارت کوروؤں اور پانڈوؤں کے مابین جنگ کی داستان ہے اسی میں جب دونوں فریق آمنے سامنے جنگ کے لیے آمادہ تھے تو شری کرشن مہاراج نے دونوں کے بیچ اپنا رتھ لا کر جنگ روک دی اور اس وقت جو اُپدیش انہوں نے دیا وہ 'بھگوت گیتا' کے نام سے موسوم ہے۔ اس اپدیش میں دانش، فلسفہ، خیر و شر اور حیات و کائنات میں انسان کی کامیابی، ناکامی اور اس کے مقدرات اور کرم اور نیہ کرم کے بارے میں نہایت بصیرت افروز کلمات ملتے ہیں۔ اسی طرح رامائن جسے تلسی داس اور والمیک جی نے اپنے اپنے انداز میں تحریر کیا ہے، رام چندر جی اور راون کے مابین جنگ کی داستان ہے، جس کے غیر معمولی اثرات نہ صرف برصغیر پاک و ہند بلکہ عالمی ادب پر بھی مرتب ہوئے ہیں۔ اسی طرح قدیم یونان میں ٹروجن وار جو ہیلن کے اغوا کے ضمن میں شروع ہوئی تھی اور جسے ہومر نے ایلیڈ (Iliad) کے عنوان سے تخلیقی شاہکار بنا دیا، جنگوں ہی کی دین ہے۔

تاریخ کی طرف جایئے یا روایات پر بھروسا کیجیے تو روئے زمین پر پہلی جنگ ہابیل و قابیل

کے مابین ہوئی۔ اس کے محرکات ونتائج کے بارے میں متعدد روایات تاریخ انسانی کے صفحات پر مرتسم ہیں۔ ہزاروں صدیاں گزر جانے کے عمل میں ایک پہلو یہ نمایاں ہوا ہے کہ اس جنگ میں قابیل نے آلۂ ہلاکت کے طور پر جو پتھر استعمال کیا تھا وہ 'ارتقائی مراحل' طے کرتا ہوا اب ایٹم بم ہائیڈروجن بم اور اسی قسم کے مہلک ہتھیاروں میں تبدیل ہو چکا ہے۔ دو یا اس سے زیادہ افراد کے عمل سے جو شے جنگ کے نام پر شروع ہوئی تھی وہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے اس دور میں خود ایک سائنس بن چکی ہے۔ اس تناظر میں دیکھیے تو سائنس اور ٹیکنالوجی جس قدر نوعِ انسانی کی صحت، تحفظ اور بقا کے لیے کام کر رہی ہے۔ اس سے کہیں زیادہ اس کی ہلاکت اور تباہی کا سامان ایجاد کر رہی ہے۔ اس موقع پر دانشور شاعر منیب الرحمٰن کی ایک نظم کے یہ مصرعے یاد آ رہے ہیں۔

جنگ قابیل کے بیٹوں کا بہیمانہ جنوں
آخری لرزشیں گرتے ہوئے ایوانوں میں
اسلحہ جات کا، طاقت کا، حکومت کا فسوں
شہپر موت کی تاریک فضا میں لرزش
خون اُمڈا ہوا آنکھوں میں، دہن شعلہ فشاں
شہر کے کوچہ و بازار میں پیروں کی دھمک
سینہ تانے ہوئے کہسار کے مانند جواں

ہر دور میں جنگ سے متعلق ادب تخلیق ہوتا رہا ہے۔ لوک ادب میں بھی اس کی اَن گنت مثالیں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ جو جنگیں رسول وار کے نام پر برطانیہ، امریکہ، اسپین اور دوسرے مقامات پر ہوئیں، کربلا کا خونچکاں واقعہ، صلیبی جنگیں، وارز آف روزز، جنگِ افیون کسی نہ کسی صورت میں ادب کا حصہ بنیں۔ ہماری اپنی روایات میں عربی، فارسی، سنسکرت، ہندی اور اردو کے علاوہ برصغیر کی متعدد زبانیں شامل ہیں۔ عربی میں 'حماسہ سرائی' (epic) کے علاوہ فارسی میں 'شاہنامہ فردوسی'، نظامی کا 'سکندر نامہ'، اس کے علاوہ برصغیر پاک و ہند میں چونکہ ابتداً مسلمانوں کے دورِ حکومت میں فارسی کا رواج تھا اس لیے امیر خسرو وہ پہلے اہم شاعر نظر آتے ہیں جنہوں نے کئی مثنویات جنگ سے متعلق لکھی ہیں۔ ان مثنویات کو شاعرانہ محاسن کے علاوہ تاریخی مآخذ کے طور پر بھی قبول کیا گیا ہے۔ چنانچہ ایلیٹ اینڈ داؤسن نے اپنی اہم تاریخ 'History of India

'As Told by Its Own Historians' میں امیر خسرو کو بطور مؤرخ شامل کیا ہے۔ نثر میں ابوالفضل کی 'آئینِ اکبری' تاریخ کے ساتھ ساتھ ایک ادبی شاہکار بھی ہے۔

ایک اور مثال مرزا غالب کی ہے جنہیں بہادر شاہ ظفر نے خاندانِ تیموریہ کی تاریخ لکھنے کا کام سپرد کیا۔ مرزا غالب نے اس تاریخ کو دو حصوں میں دو ناموں سے موسوم کیا۔ ایک 'مہر نیم روز' اور دوسرا 'ماہِ نیم ماہ'۔ ساتھ ہی انہوں نے اس امر کا بھی اظہار کیا کہ میں کوئی مؤرخ نہیں ہاں اگر مجھے تاریخی مواد فراہم کر دیا گیا تو میں اپنے انداز میں تاریخ لکھ سکوں گا۔ مرزا نے 'مہر نیم روز' مکمل کر لی اور یقیناً وہ ایک ادبی شاہکار ہے لیکن اسی اثنا میں ۱۸۵۷ء کی بغاوت اور جنگِ آزادی کے ہنگاموں میں یہ منصوبہ ادھورا رہ گیا۔ البتہ مرزا غالب نے اس آشوب اور انتشار کو اپنے ایک روزنامچے 'دستنبو' میں بڑی دلسوزی اور دردمندی سے محفوظ کر لیا۔ اس کے علاوہ اس زمانے میں انہوں نے اپنے احباب اور شاگردوں کو جو خطوط لکھے وہ اس قدر اہم ہیں کہ تاریخی وقائع بھی ان کا بدل نہیں ہو سکتے۔ اس پر مستزاد غالب کا اندازِ بیاں۔

سرسیّد احمد خاں کو بھی تاریخ سے بہت گہری دلچسپی تھی انہوں نے ابوالفضل کی 'آئینِ اکبری' کے متن کی تصحیح کر کے اس کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا۔ یہ کام بھی ۱۸۵۷ء کی یورش کی نذر ہو گیا۔ اس کتاب کے لیے انہوں نے مرزا غالب سے کچھ لکھنے کی فرمائش کی تھی۔ جواب میں مرزا غالب نے ایک منظوم تقریظ لکھی جس میں سرسیّد کو یہ نصیحت کی گئی تھی کہ یہ زمانہ گڑے مردے اکھاڑنے کا نہیں ہے۔ زمانہ بدل چکا ہے انگریز اپنے ساتھ جو ٹیکنالوجی، نئی ایجادات، برق و بخارات کے کرشمے اور عدالت و انصاف کے محکمے، ڈاک و تار کا نظام، ریل اور دخانی جہاز لائے ہیں، ان کی بنا پر جو تبدیلی زمانے میں رونما ہو رہی ہے اس پر توجہ کرو کیونکہ مردہ پرستی کوئی مبارک کام نہیں ہے۔

'مردہ پروردن مبارک کار نیست'

بیسویں صدی میں جو دو عالمی جنگیں ہوئیں وہ انسانی تاریخ میں ہولناک تصادم کی حیثیت سے برابر یاد کی جاتی ہیں۔ ان دونوں جنگوں کے حوالے سے جو ادب تخلیق کیا گیا ہے، جو کتابیں، دستاویزیں اور فلمیں تیار کی گئی ہیں ان سے جنگ کی تاریخ اور جنگ کے متعلقات بجائے خود ایک انڈسٹری بن چکے ہیں۔

پہلی جنگِ عظیم ۱۹۱۴ء میں شروع ہوئی۔ اس وقت بھی عالمی سیاست کو جن ملکوں نے متاثر کیا

ان میں ترکی، ٹریپولی اور ہندوستان زیادہ متاثر ہوئے۔ جب اٹلی نے طرابلس پر حملہ کیا تو راشد الخیری اور سجاد حیدر یلدرم جیسے افسانہ نگاروں نے اس موضوع پر قلم اٹھایا۔ جنگِ بلقان پر کئی افسانے اور ناول لکھے گئے، خاص طور پر 'شوکت آرا بیگم' جیسے ضخیم ناول میں جنگِ بلقان سے متعلق اہلِ ہند کے جذبات و خدمات کی ایک مفصل تصویر سامنے آجاتی ہے۔ اسی طرح مولانا ابوالکلام آزاد نے 'محاصرۂ اَدرنہ' جیسی تحریریں قلمبند کیں اور اپنے پرچوں 'الہلال' اور 'البلاغ' کے ذریعے جنگی منظرنامے کو ادبی رکھ رکھاؤ کے ساتھ معلوماتی انداز میں قارئین تک پہنچایا۔ ہمارے متعدد ادبا وشعرا نے اس سے پہلے بھی انگریزوں کی جنگجویانہ پالیسی کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے الزام میں مولانا فضل حق خیرآبادی، مولانا جعفر حسین تھانیسری، مولانا محمود الحسن (شیخ الہند) اور مجاہد شاعر منیر شکوہ آبادی کو کالے پانی کی سزا دے کر جزائر انڈمان بھیج دیا گیا۔ یہ بھی انگریزوں کی توسیع پسندانہ حکمتِ عملی کا اک حصہ تھا جسے ان اہلِ قلم اور اہلِ دانش نے دستاویزات کی شکل دے دی۔

علامہ اقبال پہلی جنگِ عظیم کے بارے میں 'پیامِ مشرق' کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

'یورپ کی جنگِ عظیم ایک قیامت تھی جس نے پرانی دنیا کے نظام کو قریباً ہر پہلو سے تباہ کر دیا اور اب تہذیب و تمدن کی خاکستر سے فطرت زندگی کی گہرائیوں میں اِک نیا آدم اور اِک نئی دنیا جنم لے رہی ہے جس کا دھندلا سا خاکہ حکیم آئن اسٹائن اور برگساں کی تصانیف میں ملتا ہے۔'

اقبال نے پہلی جنگِ عظیم کی ہولناکیوں اور اس سے رونما ہونے والے مسائل کو محسوس کرتے ہوئے اِک نئے آدم اور اور اِک نئی دنیا کی بشارت دی۔ یہیں سے شاعر احمد ندیم قاسمی کا یہ شعر چہرہ نمائی کرتا ہے۔

یہ زمیں یہ خلا کی رقاصہ
آدمِ نو کے انتظار میں ہے

اقبال نے آئن اسٹائن اور برگساں کی تصانیف سے نئی دنیا کے روشن امکانات کی توقع باندھی تھی لیکن وقت نے ثابت کر دیا کہ آئن اسٹائن کی تمام تر عظمت و فضیلت کے باوجود ایٹم بم کا تجربہ اور ہیروشیما اور ناگاساکی کی انسان کش بربادیاں بہرحال E=mc2 ہی کا شاخسانہ تھیں۔

رہے برگساں تو ان کا فلسفہ 'Elan Vital' کو عالمی سطح پر کوئی مقبولیت حاصل ہوئی اور نہ نئی دنیا کی تشکیل میں اس کا کوئی دخل نظر آتا ہے۔

پہلی اور دوسری عالمی جنگوں کے مابین جو مدت گزری اس کا احوال بھی زیادہ خوش کن نہیں رہا۔ یہاں تک کہ 'ضربِ کلیم' کی اشاعت کے موقع پر اقبال نے سرنامہ یوں تحریر کیا:

'دورِ حاضر کے خلاف اعلانِ جنگ'

ادھر مغرب میں بھی اس کے اثرات کو زیادہ محسوس کیا گیا اس لیے کہ اصل تباہی تو مغرب ہی کے علاقوں اور باشندوں کو برداشت کرنا پڑی۔ مغرب کی تمام زبانوں میں ان جنگوں کے خلاف لکھا گیا اس سے جو تہذیبی بنجر پن اور انسان کی تخریبی صلاحیتوں کا ویرانہ سامنے آتا۔ اسے ٹی ایس ایلیٹ جیسے شاعر نے Wasteland جیسی شاہکار نظم میں تخلیقی سطح دے دی۔ اسی طرح انہوں نے 'Ash Wednesday' اور 'Hollow Man' جیسی نظمیں تحریر کیں اس کے علاوہ ان تمام شعرا نے جو Auden Generation (نسلِ آڈن) کے نام سے موسوم ہیں۔ جنگ کی تباہ کاریوں پر مؤثر نظمیں لکھی ہیں۔ ان میں خود آڈن کے علاوہ لوئی میکنیس، اسٹیفن سپنڈر، سی ڈے لوئس اور کرسٹافر ایشر ووڈ (Faremel to Berlin) ان کے علاوہ بھی اپنے اپنے انداز میں ایڈتھ سٹویل، ایذرا پاؤنڈ، جارج آرویل، ورجینیا وولف، ہیمنگ وے، ٹامس مان، اور گنٹر گراس جیسے ناول نگاروں اور شاعروں نے یادگار تصانیف تخلیق کیں۔ ڈرامے کی دنیا میں لورکا، بریخت اور ایلیٹ نے غیر معمولی تجربے کیے۔ اس تمام جنگ اور ادب کے حوالوں میں ایک شاہکار یوٹالسٹائی کی 'وار اینڈ پیس' (جنگ اور امن) ہے جسے فکشن میں شیکسپیئر کا ہم مرتبہ قرار دیا جاتا ہے۔

پہلی جنگِ عظیم نے تو برصغیر پاک و ہند پر اہم شدید اثرات مرتب کیے لیکن دوسری جنگِ عظیم نے یقیناً اس خطے کو ہر لحاظ سے بہت متاثر کیا۔ ایک طرف ہٹلر اور مسولینی کی فسطائیت تھی اور دوسری طرف برطانیہ، امریکہ اور روس کا اتحاد۔ لہٰذا ان ممالک کی نوآبادیاتوں کو بھی اس ضمن میں اپنا کردار ادا کرنا پڑا۔ ہندوستان کی جنوب مشرقی سرحدوں تک جن میں برما بھی شامل ہے۔ جاپان نے حملہ کر دیا۔ پھر برطانیہ نے فوجی قوت بڑھانے کے لیے برٹش انڈیا آرمی قائم کر دی جس میں ہمارے سرکردہ ادیب ن۔م۔ راشد، فیض احمد فیض، چراغ حسن حسرت، سید ضمیر جعفری بھی شریک ہوئے اور حفیظ جالندھری پبلسٹی سانگ کے محکمے (War Publicity

(Department سے وابستہ ہوئے۔ اس زمانے میں حفیظ کا گیت بہت مقبول ہوا 'میں تو چھورے کو بھرتی کرا آئی رنے'۔ اسی اثنا میں ۱۹۴۰ء کی نیوی کی بغاوت بھی اپنے اثرات دکھا گئی۔ اور بنگال کے قحط نے ایک نئی آفت ڈھادی۔ اسی زمانے میں جگر مرادآبادی جیسے غزل گو شاعر نے کہا تھا۔

بنگال کے میں شام و سحر دیکھ رہا ہوں
دیکھا نہیں جاتا ہے مگر دیکھ رہا ہوں

.....

فکرِ جمیل خواب پریشاں ہے آج کل
شاعر نہیں ہے وہ جو غزل خواں ہے آج کل

اس وقت تک ۱۹۳۵ء کی عالمی ترقی پسند تحریک کا آغاز ہو چکا تھا اور برصغیر میں بھی ۱۹۳۶ء میں اس کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ لہٰذا زیادہ حقیقت پسندانہ انداز میں ان موضوعات پر لکھا جانے لگا۔ اقبال نے اس قسم کے سیاسی، قومی اور فکری موضوعات پر اعلیٰ سطح کی شاعری پہلے ہی پیش کر دی تھی۔ اس سے بعد کے آنے والوں کو روشنی ملی۔ انگریز استعماریت، غلامی اور جنگوں کی تباہ کاری پر اس دور میں سب سے زیادہ جوش ملیح آبادی نے لکھا 'ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے خطاب'، 'خونیں بینڈ اور شکستِ زنداں کا خواب' جیسی نظمیں اس دور کی یادگار ہیں۔ اس وقت سردار جعفری، کیفی اعظمی، احمد ندیم قاسمی، فیض احمد فیض، ن۔م۔ راشد، مختار صدیقی، جاں نثار اختر اور متعدد شعرا نے جنگ کے آسیب زدہ ماحول پر مؤثر نظمیں لکھیں۔ فیض نے کئی جگہ اس کا تذکرہ کیا ہے کہ دوسری عالمی جنگ نے نوجوانوں میں مایوسی اور بددلی پیدا کر دی تھی۔ سند یافتہ نوجوان ملازمتوں کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے تھے اور ایسے مناظر عام تھے۔

جابجا بکتے ہوئے کوچہ و بازار میں جسم
خاک میں لتھڑے ہوئے خون میں نہلائے ہوئے

اسی کے ساتھ یہ فضا بھی ابھرتی تھی۔

اجنبی قدموں نے دھندلا دیئے منزل کے سراغ
اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر لو

اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا......

یہ محسوسات بالکل فطری ہیں لیکن فیض جیسے باشعور شاعر کے لیے امید کا روشن دریچہ ہمیشہ کھلا رہا چنانچہ بعد کی نظموں نے جدوجہد اور بہتر مستقبل کی نشاندہی واضح طور پر نظر آنے لگی۔ مجاز کی نظم 'آوارہ' اس عہد کے منظرنامے کی تصویرکشی کے ساتھ ساتھ معاصر دنیا کے نوجوانوں کی ذہنی، جذباتی اور عملی قوت کو بھی ظاہر کرتی ہے۔

شہر کی رات اور میں ناشاد و ناکارہ پھروں
جگمگاتی جاگتی سڑکوں پر آوارہ پھروں
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

جنگ کے بارے میں مثبت باتیں بہت کم ذہن میں آتی ہیں لیکن کبھی کبھی آشوب و انتشار اور شر انگیزی میں بھی خیر کا کوئی پہلو نکل آتا ہے جیسا کہ کہا گیا ہے۔

خدا شرِ برانگیزد کہ خیر ما در آں باشد

چنانچہ برٹش انڈیا آرمی کے تحت جو تعاون اہلِ ہند سے حاصل کیا گیا اس وقت یہ معاہدہ طے پایا کہ جنگ کے خاتمے کے بعد ہندوستان کو برطانوی راج سے آزاد کر دیا جائے گا اور اس پر ہندوستانی سیاست دان اور اہلِ دانش اس لیے تیار ہو گئے کہ اب برطانوی استعماریت کا اسی طرح خاتمہ ہو سکتا تھا۔ ولیم ڈاور کنگ نے کہا تھا کہ 'جتنے لوگ جنگ کرنے کے لیے جمع ہوتے ہیں، اگر اس سے کم جنگ روکنے کے لیے جمع ہو جائیں تو صورتِ حال مختلف ہو' قرۃالعین حیدر 'آگ کا دریا' میں جنگوں کو روکنے کی عملی دانش پر بھی زور دیتی ہیں اور جنگ آزمائی کے محرکات کو بھی بے نقاب کرتی ہیں:

'اقوامِ عالم کی یہ کوشش رہتی ہے کہ جنگ و جدل کو روکا جائے اور دانشوروں کا ہر ملک میں ایک طبقہ جنگ کے خلاف کر رہا ہے اور اس نے قوموں کے درمیان محبت، رواداری اور بھائی چارے کے فروغ کے لیے کام کیا ہے۔ تاہم سیاسی و اقتصادی مصلحتیں، انتہا پسند طبقات...... جنگوں اور بیرونی حملوں کو ہوا دیتے ہیں۔'

('آگ کا دریا'، ص ۱۸۷)

بنگال کے قحط کو ادیبوں کے علاوہ مصوروں اور موسیقاروں نے بھی محسوس کیا۔ اس زمانے میں ستیہ جیت رائے اور محبوب نے 'مہانگر'، 'بھوک' اور 'روٹی' جیسی فلمیں بنائیں ان میں پیش کیے جانے والے نغمے اس وقت کی المناک فضا کو پوری طرح ظاہر کرتے ہیں۔ کرشن چندر نے 'اَن داتا' جیسی مؤثر کہانی لکھی اسی طرح فضل احمد کریم فضلی کا ناول 'خونِ جگر ہونے تک' قحطِ بنگال کی حقیقت پسندانہ تصویر پیش کرتا ہے۔ زین العابدین کا مصورانہ اظہار بہت متاثر کن رہا ہے۔ مغرب میں اسپین کی خانہ جنگی نے ادیبوں، شاعروں، مصوروں، موسیقاروں پر مشتمل ایک انٹرنیشنل بریگیڈ تشکیل دینے پر مجبور کر دیا۔ اس میں لورکا اور کرسٹوفر کاڈویل جیسے غیر معمولی تخلیق کار بھی کام آ گئے۔ پکاسو نے 'گورنیکا' جیسی شاہکار پینٹنگ بنائی۔ انگریزی ادب میں تو وار پوئٹس کے نام سے ایک طبقہ ہی معرضِ وجود میں آ گیا اور بقول فلپ لارکن، وار پوئٹ کا مطلب یہ نہیں کہ وہ جنگ کے ادارے یا اس کے محرکات کو سراہے بلکہ جنگ کو روکنا اور انسانیت کو اس کے ہولناک نتائج و خطرات سے آگاہ کرنا۔ اس ضمن میں ولفرڈ اوون، روپرٹ بروک، اور ہنری نیو بولٹ جیسے شاعر شامل ہیں۔

دونوں عالمی جنگیں اپنے اثرات آج تک ادب پر محیط کیے ہوئے ہیں۔ اسی زمانے میں احمد ندیم قاسمی نے 'ہیروشیما سے پہلے ہیروشیما کے بعد' جیسا افسانہ لکھا مختار صدیقی نے جو سیاسی موضوعات اور براہِ راست اظہار سے عموماً گریزاں ہی رہے، اس سانحے پر اپنا ردِعمل یوں ظاہر کیا:

یہ وہ ہیں جن کا کوئی نام و نشاں ہے تو یہی
کچھ تو یوں مٹ گئے جیسے کہ کبھی تھے ہی نہیں
ناگاساکی جو کل خواب تھا جل پریوں کا
اور ہیروشیما وہ صنعت کا نیا گہوارہ
زلزلے آئے نہ آشوب قیامت سے مٹے
دونوں اس ذرّے کے جوہر کی کرامت سے مٹے

اسی طرح قحطِ بنگال کے بارے میں واجد جونپوری کی یہ نظم بھی بہت مشہور ہوئی۔

ندی نالے، گلی ڈگر پر لاشوں کے انبار
جان ایسی مہنگی شے کا الٹ گیا بیوپار

مٹھی بھر چاول سے بڑھ کر سستا ہے یہ مال رے ساتھی
بھوکا ہے بنگال رے ساتھی بھوکا ہے بنگال

جیسا کہ کہا گیا ہے جنگیں ختم ہو جاتی ہیں لیکن ان کے اثرات مدتوں ختم نہیں ہوتے۔ چنانچہ پہلی جنگِ عظیم، ۱۹۱۹ء کا جلیانوالہ باغ، ۱۹۳۰ء کی کساد بازاری، قحطِ بنگال اور دوسری عالمی جنگ کے اثرات متعدد تخلیقات میں نمایاں ہیں۔ اگرچہ بعض ادیب اس وقت پیدا بھی نہیں ہوئے تھے، لیکن ان کی تحریروں میں بڑی خوبی سے ان موضوعات کا صرف ہوا۔ ان میں قرۃ العین حیدر، عبداللہ حسین، خدیجہ مستور، خشونت سنگھ، کرشن چندر بطور خاص قابلِ ذکر ہیں۔ ان تمام ادیبوں کے یہاں ۱۹۱۴ء سے ۱۹۴۵ء تک کی دنیا اپنے تمام محرکات اور مضمرات کے ساتھ نظر آتی ہے۔ سجاد ظہیر نے اپنی کتاب 'روشنائی' میں اس صورتِ حال پر یہ تبصرہ کیا تھا:

> 'عالمگیر جنگ کے خاتمے ۱۹۴۵ء نے ہمارے ملک کے لیے نئے مسائل پیدا کر دیئے۔ ہٹلر کو شکست ہوگئی تھی لیکن جو سامراجی باقی رہ گئے تھے وہ دنیا اور خاص طور پر ایشیا کے محکوم ملکوں کی آزادی کا حق تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ ہوئے۔ جنگ کی مصیبتیں جھیلے ہوئے ملکوں میں آزادی اور جمہوریت کی زبردست سامراج دشمن لہر اٹھی..... جنگِ عظیم میں فاشسٹوں کی شکست اور سوویت یونین کی فتح نے مجموعی حیثیت سے سامراجی قوتوں کو کمزور کر دیا تھا..... دنیا بدلی ہوئی تھی۔ ایشیا کی دو سو سال کی محکومی کا خاتمہ قریب آ گیا تھا۔'
>
> (سجاد ظہیر 'روشنائی'، ص ۳۳۹)

ویت نام کی جنگ اور اس کے بعد عرب، اسرائیل، فلسطین، افغانستان، عراق اور ایران ان سب میں جو واقعات رونما ہوئے ان پر بہت کچھ لکھا گیا۔ عرب شعرا میں محمود درویش، معین بسیسو، سمیح القاسم، نزار قبانی بطور خاص قابلِ ذکر ہیں۔ فیض احمد فیض چونکہ بنفسِ نفیس فلسطینی جنگوں کے دوران ان علاقوں میں رہے، اس لیے ان کی متعدد نظمیں خاص طور پر ان کی نظموں کی کتاب 'سرِ وادیِ سینا' اس تخلیقی سفر کو پورے زاویوں کے ساتھ اجاگر کرتی ہے۔ پھر ہماری اپنی سرزمین پر ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی جنگیں ہوئیں اور اس ضمن میں بھی نثر و نظم میں خاصا سرمایہ معرضِ وجود میں

آ گیا۔ان دونوں جنگوں سے متعلق ادبی تخلیقات کی کئی دستاویزات مرتب کی جا چکی ہیں۔

جنگ کا محرک عموماً یہ ہوتا ہے کہ دو ممالک یا دو فریق کسی جذبے کے تحت ایک دوسرے کو چیلنج کرتے ہیں جیسے کہ فردوسی کے شاہنامے کا یہ شعر۔

دگر گر بہ کامِ من آید جواب
من و گرز و میدان و افراسیاب

اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ جنگ اور ادب کو ذہن میں رکھیے تو ان کی اساس کچھ اس طرح نمایاں ہوتی ہے کہ جنگ کا تعلق اسٹرٹیجی سے ہوتا ہے اور ادب کا تعلق آئیڈیالوجی سے۔ جیسا کہ کہا گیا ہے کہ جنگ عمل کا نہیں، ردِعمل کا نام ہے (War is not action but reaction) وہ ردِعمل انسانی معاشرے پر کس کس نوعیت کے اثرات مرتب کرتا ہے اس کی ایک جھلک ساحر لدھیانوی کے ان اشعار میں بڑی حقیقت پسندی کے ساتھ نمایاں ہوئی ہے۔

مغرب کے مہذب ملکوں سے کچھ خاکی وردی پوش آئے
اٹھلاتے ہوئے مغرور آئے لہراتے ہوئے مدہوش آئے
خاموش زمیں کے سینے میں خیموں کی طنابیں گڑنے لگیں
مکھن سی ملائم راہوں پر بوٹوں کی خراشیں پڑنے لگیں
فوجوں کے بھیانک بینڈ تلے، چرخوں کی صدائیں ڈوب گئیں
جیپوں کی سلگتی دھول تلے، پھولوں کی قبائیں ڈوب گئیں
بستی کے سجیلے شوخ جواں، بن بن کے سپاہی جانے لگے
جس راہ سے کم ہی لوٹ سکے اس راہ کے راہی جانے لگے

.....

دھول اُڑنے لگی بازاروں میں، بھوک اُگنے لگی کھلیانوں میں
ہر چیز دوکانوں سے اٹھ کر روپوش ہوئی تہہ خانوں میں

.....

افلاس زدہ دہقانوں کے ہل بیل بکے کھلیان بکے
جینے کی تمنا کے ہاتھوں جینے ہی کے سب سامان بکے

کچھ بھی نہ رہا جب بکنے کو، جسموں کی تجارت ہونے لگی
خلوت میں بھی جو ممنوع تھی، وہ جلوت میں جسارت ہونے لگی

جنگ کی ان تمام تباہ کاریوں کے باوجود تجربہ یہی بتاتا ہے کہ قلم میں بم سے زیادہ طاقت ہوتی ہے اس کا ثبوت تاریخ انسانی کئی بار فراہم کر چکی ہے۔ بیسویں صدی میں اس کی ایک بڑی مثال کیوبائی جنگ پر امریکہ اور روس کے تصادم کو روکنے کے لیے برٹنڈرسل کی تحریریں ہیں جو 'غیر مسلح فتح' (Unarmed Victory) کے نام سے کتابی شکل میں محفوظ ہو چکی ہیں۔

ادیب اور شاعر کا کام صرف واقعات کی ہولناکی سے روشناس کرانا ہی نہیں بلکہ ان کا سدِ باب بھی کرنا ہوتا ہے۔ آیندہ کسی بڑی جنگ کے کیا بڑے اثرات ہو سکتے ہیں۔ اس پر بہت کچھ لکھا اور کہا جا سکتا ہے۔ لیکن میں اپنے معروضات کو ساحر کی نظم 'پرچھائیاں' کے ان اشعار پر ختم کرنا چاہوں گا۔

اٹھو کہ آج ہر اِک جنگجو سے یہ کہہ دیں
کہ ہم کو کام کی خاطر کلوں حاجت ہے
ہمیں کسی کی زمین چھیننے کا شوق نہیں
ہمیں تو اپنی زمیں پر ہلوں کی حاجت ہے

.....

کہو کہ آج بھی ہم سب اگر خموش رہے
تو اس دمکتے ہوئے خاکداں کی خیر نہیں
جنوں کی ڈھالی ہوئی ایٹمی بلاؤں سے
زمیں کی خیر نہیں، آسماں کی خیر نہیں

.....

گزشتہ جنگ میں گھر ہی جلے مگر اس بار
عجب نہیں کہ یہ تنہائیاں بھی جل جائیں
گزشتہ جنگ میں پیکر جلے مگر اس بار
عجب نہیں کہ یہ پرچھائیاں بھی جل جائیں

☆☆☆

جنگ اور شعبۂ طب

ڈاکٹر ٹیپو سلطان

اس کرۂ ارض پر ہر جاندار (species) کا دیگر جانداروں سے کسی نہ کسی مسئلے کے باعث اختلاف ہوتا رہا ہے جس میں ایک اہم وجہ مزید قبضہ حاصل کرنا، مرد کی بالادستی تسلیم کروانا یا پھر کسی گروہ کی طرف سے حاصل شدہ شکار کو تقسیم کرنے کے عمل پر اختلاف کے باعث ہوتا رہا ہے۔ لیکن یہ جھگڑے زیادہ تر دو یا اس سے زائد افراد یا پھر نہایت ہی چھوٹے گروہوں کے درمیان ہوتے تھے۔ جس کے باعث نقصان کا احتمال بہت کم ہی ہوتا ہے۔ ان ابتدائی لڑائیوں میں سے بہت ہی کم ایسی لڑائیاں ہوں گی جن میں لڑائی میں حصہ لینے والے گروہوں کی تعداد بڑی ہو۔

ان تمام جانداروں میں آج بھی لڑائیاں ان ہی اصولوں کے تحت لڑی جارہی ہیں۔ لیکن ان جانداروں میں انسان شاید وہ واحد جاندار ہے جس نے تاریخ کے اس سفر میں اپنی لڑائی کے طریقوں کو بڑی حد تک تبدیل کرلیا ہے اور گذشتہ چند صدیوں کے دوران تباہی و بربادی کے لیے نت نئے طریقے تلاش کرلیے ہیں۔ انفرادی افراد یا گروہ کے درمیان پائے جانے والے وجۂ اختلاف کو جب تلاش کرنے کی کوشش کی جائے تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اس کے پس پشت زر، زن اور زمین کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔

قرآن سمیت دیگر الہامی کتب کے مطابق اس کرہ ارض پر قتل ہونے والا سب سے پہلا انسان ہابیل تھا اور قاتل قابیل تھا۔ قاتل کو اس بات کا بھی اندازہ نہ تھا کہ کس طرح مقتول کی نعش

کو ضائع (dispose off) کیا جائے۔ عالمی جنگوں سے قبل تک ہونے والی جنگوں کو کسی حد تک مہذب (civilized) کہا گیا ہے جس کا مقصد زمین کا حصول، یا مال و دولت پر قبضہ جمانا تھا۔ زن کے لیے لڑی جانے والی جنگوں کی مثالیں خال خال دیکھنے کو ملتی ہیں۔ قدیم جنگی اصولوں کے مطابق فوجیں میدان جنگ میں اکھٹا ہوتیں۔ یہ میدان جنگ عام طور پر آبادی اور شہروں سے کچھ فاصلے پر کھلے میدانوں میں ہوتے تھے۔ لڑائی ابتدائی طور پر چند انفرادی افراد یا پھر تمام فوجیوں کے درمیان لڑی جاتی تھی جو کہ جنگ کا فیصلہ کرتے تھے۔ فاتح مفتوحہ علاقوں میں گھس کر لوٹ مار کرتے اور مفتوحہ لوگوں کو یا قتل کر دیا جاتا یا پھر غلام اور لونڈی بنا لیا جاتا۔ جنگوں کے نتیجے میں زخمی ہونے والے افراد کو روایتی طریقہ کار کے مطابق علاج و معالجہ فراہم کیا جاتا۔ روایتی ہتھیاروں کے استعمال کے باعث تباہی زیادہ تر میدان جنگ یا پھر اس لڑائی کے نتیجے میں براہ راست متاثر ہونے والے افراد تک ہی محدود رہتیں۔

قوموں کی تاریخ بتاتی ہے کہ بڑی تعداد میں فوج کو اکھٹا کر کے حملہ آور ہونے کا سلسلہ کافی بعد میں شروع ہوا۔ یقیناً اتنی بڑی تعداد میں دونوں طرف کی فوجوں کا جنگ میں حصہ لینے کے باعث نقصان بھی بڑے وسیع پیمانے پر ہونا شروع ہوا۔ جنگ کے بعد کی وسیع تر تباہی کے باعث بڑی تعداد میں انسان کے اپنے اعضا سے محروم ہونا، گہرے گھاؤ کے باعث مختلف قسم کی پیچیدہ بیماریوں میں مبتلا ہو جانا، وسیع پیمانے پر بے روزگاری کا پھیلنا اور سب سے اہم جنگوں کے باعث نفسیاتی مسائل کا سامنے آنا شامل تھا۔ جنگوں میں بری طرح زخمی ہو جانے والے ہزاروں سپاہیوں کی جانوں کو بچانے کے لیے بسا اوقات زخمیوں کے جسم کے اعضاء مثلاً ہاتھ، پاؤں، یا ٹانگ وغیرہ کو کاٹ کر جسم سے الگ کیا جاتا۔ جس کے باعث یہ سپاہی اپنی باقی ماندہ زندگی مستقل طور پر معذور انسان کے طور پر گزارنے کے لیے مجبور ہو جاتے۔

ہمیں انسانی تاریخ میں کچھ ایسے افراد بھی ملتے ہیں جنہوں نے ان جنگوں کے دوران شہروں، قصبوں، اور انسانی بستیوں کو مکمل طور پر تباہ و برباد کرنے، صفحہ ہستی سے مٹانے اور وسیع

پیمانے پر انسانوں کے قتل عام میں مہارت حاصل کر لی تھی۔ ان ہی میں سے ایک نام چنگیز خان کا بھی ہے۔

ان قدیم اور روایتی جنگوں میں رفتہ رفتہ بڑی نمایاں تبدیلی نظر آئی اور پہلی اور دوسری جنگ عظیم نے تباہی و بربادی کے نئے زاویئے کھول دیئے۔ ان دونوں جنگوں میں روایتی ہتھیاروں کو پس پشت ڈالتے ہوئے تباہی کے نئے ہتھیار متعارف کرائے گئے۔ خود کار اور جدید رائفلوں، خطرناک بموں، ٹینکوں، بحری جہازوں، اور ہوائی جہاز کے ذریعے گرائے جانے والے بموں نے ایسی تباہی پھیلائی جو کہ اس سے قبل دیکھنے کو نہیں ملی تھی۔ ان تباہ کن ہتھیاروں کے استعمال کے باعث نئی نئی بیماریاں دیکھنے کو ملیں۔ بموں کے باعث بڑی تعداد میں لوگ جھلسنے لگے۔ اب جنگوں کا دائرہ کار صرف محاذِ جنگ اور فوجی نہ تھے بلکہ اس سے پورے ملک اور علاقے متاثر ہونے لگے۔ مخالف قوموں کے حواس شل کرنے اور انہیں شکست تسلیم کرنے پر مجبور کرنے کے لیے مخالف قوموں اور ملکوں کے شہروں کو نشانہ بنایا جانے لگا۔ جس کا ہدف یقیناً عام اور معصوم شہری بننے لگے۔ گنجان آبادیوں پر ان گرائے جانے والے بموں کے اصل ہدف اور متاثرین فوجیوں کے بجائے عام شہری بننے لگے۔ تھوڑے ہی عرصے میں مزید ایسے بم بنائے گئے جن کے پھٹتے ہی وسیع علاقوں میں آگ بڑھک اٹھتی جس کے باعث تباہی بڑے وسیع پیمانے پر ہوتی۔

طب کے شعبے نے دیگر شعبوں میں ترقی کی تو اسی طرح اس کو جنگ کی تباہ کاریوں کے باعث پیدا ہونے والی صورت حال کا سامنا کرنے کے لیے اپنے آپ کو تیار کرنا پڑا۔ اس کے باعث اس میں کئی نئی تبدیلیاں دیکھنے کو ملیں۔ دوسری جنگ عظیم اور اس کے بعد لڑی جانے والی کئی جنگوں میں نئے ہتھیار اور بایولاجیکل ہتھیاروں کا استعمال متعارف کرایا گیا۔ ان مہلک اور خطرناک ہتھیاروں نے انسانی معاشرے میں تباہی و بربادی کے نئے در کھول دیئے۔ ان خطرناک کیمیائی ہتھیاروں نے نہ صرف وسیع پیمانے پر انسانوں کو موت کے منہ میں دھکیلا بلکہ انہیں ایسی پراسرار بیماریوں میں بھی مبتلا کر دیا جس کی نظیر اس سے قبل دیکھنے کو نہیں ملی۔

دوسری جنگ عظیم میں دنیا کا خطرناک ترین ہتھیار ایٹم بم کا استعمال دیکھنے کو ملا۔ امریکہ نے جاپان کے دو شہروں ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم گرا کر ان علاقوں میں تباہی و بربادی کی ایک نئی تاریخ رقم کر دی۔ لمحوں میں پورے شہر جل کر خاکستر ہو گئے اور لاکھوں انسانوں کی فوری طور پر ہلاکتیں واقع ہوئیں۔ ہزاروں انسان زندہ تو بچ گئے لیکن وہ مردوں سے زیادہ بدتر زندگیاں گزارنے پر مجبور ہو گئے۔ کچھ لوگ بینائی سے محروم ہوئے تو کچھ بہرے ہو گئے۔ کئی کی جلد آگ کی تپش سے جل گئی۔ کیمیکل ملے پانی اور خوراک کے استعمال سے مزید ہلاکتیں ہوئیں۔ جاپان کے لیے یہ ایسی تباہ کن صورت حال تھی کہ جس کے لیے جاپانی قوم کسی طرح تیار نہ تھی۔ ان نئی بیماریوں کے لیے کوئی موثر طبی نظام موجود نہ تھا۔ اتنی وسیع پیمانے پر ہونے والی تباہی کو روایتی طریقہ طب سے حل کیا جانا تقریباً ناممکن تھا۔ جاپان میں اس ایٹمی تباہ کاری کے اثرات کئی دہائیوں تک بڑی بدترین صورت میں سامنے آتے رہے۔ حد تو یہ تھی کہ کئی سال بعد میں بھی ان متاثرہ علاقوں میں پیدا ہونے والے بچے کئی قسم کی اجنبی بیماریوں میں مبتلا پیدا ہوتے رہے۔ اس تباہی نے ایٹمی ہتھیاروں کے خلاف ایک عالمی تحریک کو جنم دیا۔ لیکن اب تک اس کے خاطر خواہ نتائج سامنے نہیں آئے۔

ویت نام کی جنگ میں امریکہ کی طرف سے شدت سے بمباری (Carpet Bombing) کا ایک نیا رجحان سامنے آیا جس کے تحت مخصوص علاقوں میں ایک ہی وقت میں ہزاروں بم ہوائی جہازوں سے برسائے جانے لگے جس کا مقصد اس بات کو یقینی بنانا تھا کہ اس مخصوص علاقے میں موجود تمام انسانوں اور دیگر جانداروں کی موت کو یقینی بنانا تھا۔ ویت نام کی جنگ نے حالیہ تاریخ میں انسانوں کے ہاتھوں دیگر انسانوں کی تباہی کی ایک نئی تاریخ رقم کی۔ اس جنگ اور اس کے بعد ہونے والی دیگر جنگوں کے بعد اسلحہ سازی نے ایک بھرپور صنعت کا درجہ حاصل کر لیا۔ کئی ممالک تو اب برآمدات کا بیشتر حصہ اسلحہ بیچ کر کمائی کر رہے ہیں اب مزید تباہ کن اسلحہ بنانے کے لیے تحقیق پر اربوں ڈالر خرچ کیے جا رہے ہیں۔ ان تباہ کن اسلحے کے استعمال کے

باعث اب جنگوں کے اختتام پر ہونے والے اثرات مزید تباہ کن ہیں۔جنگوں کے باعث نت نئے مسائل سامنے آرہے ہیں۔

ان مسائل کو دیکھتے ہوئے میڈیکل سائنس نے بھی نئی نئی ادویات متعارف کرنا شروع کردی ہیں۔مثلاً پینسلین کی ایجاد کا باعث بھی یہی جنگ تھی۔جدید ہتھیاروں کے استعمال کے باعث چند منٹوں اور لمحوں میں اچانک ہزاروں لاکھوں کی ہلاکت ایک معمول بن گئی ہے۔اس کے ساتھ ساتھ جنگوں کی تباہ کاریوں کے باعث کئی نفسیاتی بیماریوں مثلاً depression وغیرہ معمول بن گئے ہیں۔جنگوں میں حصہ لینے والے فوجیوں میں depression ، پریشانی اور بے چینی (Anxiety) اور کئی قسم کے انجانے خوف (Phobia) دیکھنے کو مل رہے ہیں۔ان کے باعث کئی مرتبہ جنگ سے لوٹے ہوئے یہ افراد یا تو ذہنی طور پر اپنا توازن کھو دیتے ہیں یا پھر خود کشیوں کی طرف مائل ہوجاتے ہیں۔حالیہ برسوں میں عراق اور افغانستان کے محاذوں سے واپس ہونے والے یہ افراد ایسی ہی کئی بیماریوں کا شکار ہوگئے ہیں۔ان جنگوں کے باعث ہم کئی افراد کو ناکارہ بنا رہے ہیں۔ان کارآمد انسانوں کو ہم غلط استعمال کررہے ہیں۔

پاکستان میڈیکل ایسوسی ایشن کی تحقیق کے نتیجے میں یہ بات سامنے آئی ہے کہ قبائلی علاقوں اور افغانستان کے علاقے میں ڈرون حملوں اور دیگر ہتھیاروں کے استعمال کے باعث ان علاقوں میں کئی نئی بیماریاں سامنے آرہی ہیں جن کا پہلے کسی کو کوئی علم نہ تھا۔کینسر، جلدی بیماریوں سمیت دیگر پراسرار بیماریاں بڑی تیزی سے اس علاقے کے رہائشی افراد کو اپنی گرفت میں لے رہی ہیں۔اس کے لیے ضروری ہے کہ فوری طور پر ان علاقوں میں خطرناک ہتھیاروں کا استعمال فوری طور پر بند کیا جائے اور ان نئی دریافت ہونے والی بیماریوں کے تدارک کے لیے تحقیق کا نیا سلسلہ شروع کیا جائے۔

یہ انتہائی افسوس کی بات ہے کہ دنیا کے سات ممالک ایٹمی ہتھیاروں سے لیس ہوچکے ہیں۔اگر ان ممالک نے اپنے مہلک ایٹمی ہتھیاروں کا استعمال کیا تو یہ اس کرۂ ارض کو کئی بار تباہ و برباد

کر سکتے ہیں جس کے نتیجے میں ایسی تباہی پھیل سکتی ہے جس کا تدارک شاید میڈیکل سائنس بھی نہ کر سکے۔ اس وسیع پیمانے پر پھیلنے والی تباہی کے باعث میڈیکل شعبے سے تعلق رکھنے والے ڈاکٹروں، سائنس دانوں اور دیگر تحقیقی ماہرین کے لیے یہ ایک بہت بڑا چیلنج بن گیا ہے کہ وہ اب کس طرح اس صورت حال کا مقابلہ کریں۔ اس کے ساتھ ساتھ اس شعبے سے وابستہ افراد کے لیے اب یہ بہت ضروری ہو گیا ہے کہ وہ جنگوں سے متاثرہ ان افراد کی بحالی کے لیے رنگ، نسل، مذہب، اور جنس کا لحاظ کیے بغیر اپنی پوری توانائیاں جنگ سے متاثرہ افراد کی بحالی کے لیے وقف کر دیں۔

اس جدید دور کے انسان کے لیے یہ بات باعث شرم ہے کہ اتنی ترقی کرنے کے باوجود وہ باہمی اختلافات کو بھلا کر اور بات چیت کے ذریعے حل کرنے کے بجائے اب بھی جنگ اور لڑائی کے ذریعے حل کرنے کا خواہش مند ہے جو کہ خود اس کے لیے مزید تباہی بربادی کا ساماں پیدا کر رہے ہیں ہم سب کو مل کر پوری انسانیت کو جنگ کی ان تباہ کاریوں سے بچانے کے لئے مشترکہ جدوجہد شروع کرنا ہوگی۔

☆☆☆

مذہب اور جنگ

بوسنیا کی خانہ جنگی کا ایک تنقیدی جائزہ

ڈاکٹر ریاض احمد شیخ

انسانی تاریخ میں جہاں دیگر عوامل فساد اور لڑائی جھگڑے کا باعث بنتے رہے ہیں۔ ان ہی میں مذہب بھی ایک اہم عنصر رہا ہے۔ انسانی تاریخ میں مذہب کے اولین اثرات ۵۰۰۰ سال قبل اس وقت سامنے آئے جب انسان نے اپنی قدیم طرز رہائش جس میں مکمل طور پر شکار اور گھاس پھوس پر مکمل انحصار تھا، اسے نقل مکانی کے مستقل عمل کو ترک کر کے ابتدائی زرعی طریقہ پیداوار کو اپنانا شروع کیا۔ اب انسان خانہ بدوشی کی زندگی کو ترک کر کے مستقل طور پر مخصوص علاقوں میں رہائش پذیر ہونا شروع ہوئے۔ دریاؤں کے کنارے آباد ہونے والے شہر درحقیقت اسی دور کی علامت تھے۔ دریاؤں کے قریب آباد ہونے کے باعث انسان کو زرعی مقاصد کے لیے پانی کی باآسانی اور یقینی فراہمی حاصل ہوئی۔ انسان کے زرعی دور میں داخل ہونے کے ساتھ ہی انسانی معاشرے طبقاتی بنیادوں پر بھی تقسیم ہونا شروع ہو گئے۔ اسی دوران چند گروہوں اور افراد نے اپنی بالادستی کو جائز قرار دینے کے لیے چند مافوق تصورات کو بھی آگے بڑھانا جن میں سب سے اہم عنصر مذہب کا تھا۔ اپنے استحصالی ہتھکنڈوں کو مذہبی بنیادوں پر جائز قرار دینے کے لیے اخلاقیات کا سہارا لیا گیا۔ انسانی زندگیوں میں ایک 'بااثر اور 'تخلیق کار' کی بات کی گئی جو کہ اس پورے رموز اور معاملات کو کنٹرول کر رہا تھا۔ اور ایک زرعی معاشرے میں جہاں زرعی شعبے کا مکمل انحصار فطری موسم (مثلاً بارش، طوفان، آندھی، برف باری) پر ہو تو ایسے حالات میں معاشرے کے سادہ لوح

افراد کو اپنے چنگل میں پھانسنا کوئی مشکل عمل نہیں۔

انسانی معاشرے میں مذہب کے ابھر کر سامنے آنے پر اینگلز اور میکس ویبر اپنی تحقیق اور ان کے تجزیے کی بنیاد پر تصویر کی بالکل مختلف شکل پیش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مذاہب کے متعارف کرائے جانے کے تھوڑے ہی عرصے بعد مذاہب نے جو کہ خود استحصالی نظام سے نجات دلانے کے دعوؤں سے سامنے آئے تھے جلد ہی انسانوں کے استحصال کا ایک بڑا سبب بن گئے۔ اپنے بڑھتے ہوئے پیروکاروں کو اپنے زیر تسلط رکھنے اور ان کی تعداد کو مزید بڑھانے کے لیے نت نئے طریقے اور ہتھکنڈے زیر استعمال لائے گئے۔ مذہبی لیڈر خود حکمران یا پھر حکمرانوں کے حلیف اور مددگار بن گئے۔ ریاستوں کی شناخت مذاہب سے منسلک کر دی گئیں۔ ہر مذہب کی خواہش تھی کہ وہ زیادہ سے زیادہ علاقوں پر قابض ہو جائے اور اس کے پیروکاروں کی تعداد بھی سب سے زیادہ ہو۔ ان ترجیحات کے نتیجے میں مذاہب کے مابین تصادم بھی شروع ہو گیا۔ یہ اختلافات نظریاتی بنیادوں سے کہیں زیادہ اقتصادی مفادات پر مبنی تھے۔ کسی بھی علاقے پر قبضہ کا مطلب اس تمام علاقے کے وسائل پر قبضہ تھا۔ اس لالچ اور ہوس نے تصادم اور اختلاف کو جلد ہی ٹکراؤ اور جنگوں کی شکل میں تبدیل کر دیا۔

انسانی تاریخ میں مذہبی بنیادوں پر لڑی جانے والی جنگوں کی ایک طویل تاریخ ہمارے سامنے ہے۔ صلیبی جنگیں، سلطنت عثمانیہ کی جنگیں، یورپ کی عیسائی ریاستوں کی ایشیاء، افریقہ اور براعظم امریکہ کے علاقے میں لڑی جانے والی جنگیں واضح طور پر مختلف مذاہب کی بالادستی کے لیے کی جانے والی کوششیں تھیں۔ برصغیر میں مغلیہ سلطنت کے دور زوال میں مراٹھا اور دیگر قوموں کی طرف سے ہونے والی بغاوتوں کو مذہبی بنیادوں پر کچلنے کے لیے برصغیر کے علماء نے احمد شاہ ابدالی اور نادر شاہ کو حملہ آور ہونے کی طرف راغب کیا۔ فرانسی اور روسی بادشاہتیں عیسائی مذہب میں فرقہ بندی (ارتھوڈک عیسائی اور رومن کیتھولک) ہونے کے باعث اور پھر ان فرقوں پر اپنی بالادستی قائم رکھنے کے لیے ایک طویل عرصے تک ایک دوسرے کے آمنے سامنے رہے۔ عہد وسطی میں بھی مذہبی بنیادوں پر بھی انسانی قتال ایک معمول کی بات بن گئی۔ ان تمام حالات نے بالآخر یورپ میں آنے والے صنعتی انقلاب اور ابھرتی ہوئی سرمایہ داری کو اس بات پر سوچنے پر مجبور کر دیا کہ ریاست اور مذہب کو ایک دوسرے سے بالکل جدا اور الگ ہونا چاہیے کیونکہ مذہب ریاست کو

آزادانہ اپنے اختیارات کے استعمال کی اجازت نہیں دے گا۔

اسی عرصے میں جدید سائنسی تحقیقیں اور ایجادات نے صدیوں سے قائم قدیم اور فرسودہ مذہبی تصورات کو چیلنج کرنا شروع کر دیا۔ اب ان خیالات کو منطق اور عقل کی بنیادوں پر پرکھا جانا شروع ہوا اور یہ دقیانوسی مذہبی خیالات کسی بھی طرح نئے اور جدید حالات میں اپنی افادیت اور منطق ثابت کرنے کے اہل نہ تھے۔ لیکن ان تمام تر کوششوں کے باوجود مذہب انسانی معاشرے کا ایک اہم عنصر بنا رہا۔ سیکولر بنیادوں پر غیر جانبدارانہ ریاست کے وجود میں آجانے کے باوجود کئی جگہوں پر مذہب کا کردار بڑا اہم رہا اور ۱۹۱۷ء میں سوویت یونین میں آنے والے عوامی انقلاب نے دنیا کے پسے ہوئے انسانوں کے لیے امید کی ایک نئی جوت جگادی۔ طبقاتی بنیادوں پر انسانی معاشرے کے مسائل کے حل کے لیے عملی کوششیں شروع ہوگئیں۔ ان کاوشوں کے باعث سرمایہ دارانہ قوتوں کو اپنے مفادات خطرے میں نظر آئے اور انہوں نے مذہب کو جو کہ صنعتی عمل کے شروع ہونے کے ساتھ ہی کمزور ہوتا جا رہا تھا اسے سوشلزم کے مقابل لا کھڑا کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ دوسری جنگ عظیم میں سرمایہ دارانہ دنیا میں اپنے مفادات کی بنیاد پر لڑی جانے والی جنگ میں تباہی و بربادی کا سامنے کرنے اور کروڑوں انسانوں کی ہلاکت کے باوجود کسی کو بھی واضح فتح نہ ملنے کے بعد بالآخر یہ سوویت یونین ہی تھا جس نے فاشسٹ جرمنی کے آگے مزاحمت کی مضبوط دیوار کھڑی کر دی اور سوویت یونین میں شکست کھانے کے بعد اب جرمن اور اس کی دیگر اتحادی قوتوں کو اپنا کنٹرول رکھنا باقی نہ رہا۔ لیکن جنگ عظیم دوئم نے ایک بات واضح کر دی کہ سوشلزم ایک مضبوط متبادل کے طور پر سامنے آ گیا اور سرمایہ دارانہ نظام کو اس نئے عوامی طرز حکومت سے شدید خطرات لاحق ہوئے۔ جس کے باعث سرمایہ دارانہ نظام نے مذہب کو سوشلزم کے مقابل لا کھڑا کر دیا۔ سوشلزم اور عوامی حکمرانی پر یقین رکھنے والوں کو دھریے اور مذہب سے لابالغ قرار دیا گیا۔ مذہبی جنونیوں نے سوشلسٹوں اور استحصالی نظام کے خلاف بات کرنے والوں کو مذہب کا باغی اور دھریہ قرار دیتے ہوئے ان کے خلاف ہر قدم کو جائز قرار دیا۔

دوسری جنگ عظیم نے جہاں دنیا کو سرد جنگ میں دھکیلا وہیں عالمی سطح پر کئی اہم تبدیلیاں بھی دیکھنے کو ملیں۔ روایتی اور قدیم یورپی استحصالی ریاستوں مثلاً برطانیہ، فرانس، ہالینڈ، اور دیگر ریاستوں کے لئے اب اپنے نوآبادیاتی علاقوں پر قبضے قائم رکھنا ممکن نہ رہا۔ عوامی مزاحمتوں کے

نتیجے میں کئی نئی ریاستیں وجود میں آئیں۔ یہ معاملہ صرف ایشیا اور افریقہ تک ہی محدود نہ رہا بلکہ یورپ میں بھی بڑی دور اثر تبدیلیاں دیکھنے کو ملیں۔ کئی ریاستوں کی ٹوٹ پھوٹ ہوئی۔ کئی ریاستیں نئے نظریات کے زیر اثر اپنی بدلی ہوئی شکل میں سامنے آئیں اور کئی استحصالی ریاستوں کو کسی حد تک ہی صحیح بہر حال اپنے روایتی، استحصالی ہتھکنڈوں سے پسپائی اپنانا پڑی۔

ان تمام تبدیلیوں کے دوران ہی یورپ میں ایک نئی سوشلسٹ اور عوام دوست ریاست یوگوسلاویہ بھی ابھر کر سامنے آئی۔ مارشل ٹیٹو جس نے اٹلی اور جرمنی کے فاشسٹوں کے خلاف گوریلا اور عوامی مزاحمت میں بڑا اہم کردار ادا کیا تھا، اس جنگ کے اختتام پر یوگوسلاویہ کی تمام عوامی اور سوشلسٹ قوتوں کو اکٹھا کر کے ایک نئی ریاست کو سامنے لے آئے۔ سلطنت عثمانیہ اور آسٹرو ہنگرین (Austro-Hungrian Empire) کے سابقہ علاقوں کو اکٹھا کر کے مارشل ٹیٹو نے ایک عوام دوست سوشلسٹ ریاست کے قیام کا اعلان کیا۔ جہاں یہ ریاست ایک طرف سوشلسٹ تھی وہیں ساتھ ہی ساتھ یہ غیر وابستہ تحریک کا بھی حصہ تھی اور سرد جنگ کے کسی بھی بلاک کا حصہ بننے کو تیار نہ تھی۔ بوسنیا، کروشیا، سربیا، البانیہ، مانٹیگرو جیسے بالکل ہی مختلف النوعیت علاقوں کو صرف ایک اصول (یعنی سوشلسٹ طرز نظام) کے تحت ایک مضبوط فیڈریشن میں ضم کر دیا۔ اور دنیا نے دیکھا کہ تمام مخالفت کے باوجود مارشل ٹیٹو کا یہ تجربہ بڑی کامیابی کے ساتھ ان کے انتقال (۱۹۸۰ء) تک بڑی کامیابی سے آگے بڑھتا رہا اور یوگوسلاویہ یورپ کے ایک مضبوط اور غیر وابستہ تحریک کے ایک اہم رکن کے طور پر اپنا کردار ادا کرتا رہا۔

ٹیٹو کے انتقال کے بعد سربیا نے جو کہ اس فیڈریشن کا سب سے مضبوط اور بڑا علاقہ تھا (رقبے اور آبادی کے لحاظ سے) اس نے ٹیٹو کے طرز حکمرانی کو پس پشت ڈالتے ہوئے بقیہ چھوٹے علاقوں کو فیصلہ سازی کے عمل سے الگ کرنا شروع کر دیا۔ جس کے نتیجے میں ان علاقوں میں احساس محرومی اور سربیا کے خلاف بدگمانیاں پیدا ہونا شروع ہوئیں۔ ان ہی دنوں میں یورپ کے دیگر علاقوں مثلاً پولینڈ، رومانیہ، چیکوسلواکیہ وغیرہ میں بھی بے چینی کی لہر شروع ہو چکی تھی۔ ان ممالک میں ان معاملات میں سرمایہ دارانہ ممالک اور مغربی یورپ کی پوری حمایت سوشلسٹ قوتوں کے مخالفین کو حاصل رہی۔ لیکن اس بات کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ سوشلسٹ قوتیں بھی اپنی کارکردگی اس طرح نہ دکھا سکیں جن کی کہ ان سے توقع تھی بلاشبہ اس مرحلے پر ہمیں سرمایہ دارانہ

دنیا کی طرف سے سوشلسٹ ریاستوں کے خلاف ہر طرف سے ہر طرح کے حملوں کو بالکل نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ ۱۹۸۰ء کے اواخر میں ان ہی حالات کے باعث عوامی بے چینی کی صورت دیکھنے کو ملی اور ۱۹۹۰ء میں بالآخر کھلے عام سربیا کی بالادستی کو للکارنے کا عمل شروع ہو گیا۔ ۱۹۹۱ء میں دو علاقوں سلووینا اور کروشیا نے سربیا سے اپنی علیحدگی کا باضابطہ اعلان کر دیا۔ یورپ کے اکثر ممالک نے ان دونوں علاقوں کی طرف سے آزادی کے اعلان کی بھرپور تائید کر دی کیونکہ انہیں بھی سربیا کے بڑھتے ہوئے عزائم سے خوف تھا۔

سلووینا اور کروشیا کی ان تحریکوں کو سربیا کی طرف سے چند ہفتوں اور ماہ کی مزاحمت کے بعد جلد ہی کامیابی حاصل ہو گئی ان علاقوں کی تحریکوں کی کامیابی کے ساتھ ہی دیگر علاقوں مثلاً بوسنیا، البانیہ اور مونٹیگرو نے بھی اپنی علیحدگی کے لیے جدوجہد شروع کر دی۔ ان علاقوں کی طرف سے علیحدگی کی تحریکوں کے شروع کیے جانے کے باعث سربیا کی حکومت نے مزید سختی کا مظاہرہ کرنا شروع کر دیا اور اس کی خواہش تھی کہ ان علاقوں میں اٹھنے والی آوازوں کو کامیاب نہ ہونے دیا جائے ورنہ اس سے سربیا کو سیاسی اور معاشی طور پر نقصان اٹھانا پڑتا۔ ان تاریخی تفصیلات اور پس منظر بیان کرنے کے بعد ہم بوسنیا سے سربیا کی علیحدگی کے دوران ہونے والے خون خرابے اور بڑے پیمانے پر کیے جانے والے قتل عام کے واقعات اور بوسنیا کی طرف سے علیحدگی پر سربیا کی طرف سے اتنی شدت سے مخالفت کرنے کے واقعات کا جائزہ لیں گے۔

بوسنیا ہرزوینا سابقہ یوگوسلاویہ کا وہ حصہ تھا جو کہ تقریباً تین صدیوں تک سلطنت عثمانیہ کا حصہ رہا اور دیگر حصوں کی نسبت اس علاقے میں مسلمانوں کی تعداد کچھ زیادہ تھی۔ ۱۸۴۸ء میں سلطان عثمانیہ کے یورپی علاقوں میں اٹھنے والی تحریک کے نتیجے میں یہ علاقہ عثمانیہ سے الگ ہو کر آسٹرو ہنگرین بادشاہت کا حصہ بن گیا اور پہلی جنگ عظیم تک عثمانیہ سلطنت کے بیشتر یورپی نو آبادیاتی علاقے اس سے علیحدگی اختیار کر چکے تھے۔ انہی میں بوسنیا بھی شامل تھا۔ یہ علاقہ عثمان سلطنت سے علیحدگی کے بعد آسٹرو ہنگرین بادشاہت کا حصہ بن گیا اور پہلی جنگ عظیم کے بعد جس میں آسٹرو ہنگرین بادشاہت کو جرمنی، اٹلی اور ترکی سمیت شکست ہوئی تو یہ علاقے الگ ہو گئے اور پہلی مرتبہ یوگوسلاویہ کی بادشاہت وجود میں آئی۔ دوسری جنگ عظیم سے قبل ہی اس علاقے میں بادشاہت کے خاتمے اور یوگوسلاویہ کی عوامی اور سوشلسٹ حکومت کے قیام کے لیے مارشل ٹیٹو کی

زیر قیادت خاموش تحریک ابھر رہی تھی۔ دوسری جنگ کے دوران اس علاقے پر جرمنی اور اٹلی کی فوجوں نے حملہ کرتے ہوئے اس پر مکمل طور پر قبضہ کرلیا۔ اس مرحلے پر مارشل ٹیٹو کی زیر قیادت ایک مزاحمتی تحریک اٹھا کی گئی جس نے فاشسٹ نازی قابضین کے خلاف عوامی حمایت سے گوریلا تحریک شروع کردی اور دوسری جنگ کے بعد اپنی سوشلسٹ ریاست کے قیام کا اعلان کردیا۔ مارشل ٹیٹو نے اپنے دور اقتدار کے ان مختلف النسل، مختلف مذاہب اور فرقوں سے تعلق رکھنے اور الگ الگ زبان بولنے والے خطوں کو یکجا رکھنے کے لیے بڑی سوچ وبچار کے بعد فیڈریشن کا ایک ایسا نظام ترتیب دیا جس کے تحت ان تمام علاقوں کو بڑی حد تک اپنے معاملات چلانے میں خود مختاری دی گئی اور مرکزی سطح پر معاملات کسی ایک شخص کو چلانے کے لیے دینے کے بجائے انہوں نے ایک کونسل ترتیب دی جہاں فیصلے تمام وفاقی اکائیوں کی مشاورت سے کیے جاتے تھے۔

اس کے ساتھ ہی مارشل ٹیٹو نے ان مختلف علاقوں کی جداگانہ حیثیت اور ثقافت کو برقرار رکھنے کے لیے ان علاقوں میں موجود مذہب، ان کی تاریخ، ثقافت، زبان اور رسم ورواج میں مداخلت کرنے کے بجائے انہیں برقرار رکھنے کی روایت ڈالی۔ حد تو یہ ہے کہ بوسنیا کے مسلمانوں کو جو کہ تاریخی طور پر سرب نسل سے ہی تعلق رکھتے ہیں لیکن عثمانی خلیفہ کے دور حکمرانی کے دوران تبدیلی مذہب کے باعث مسلمان ہو چکے تھے، ان کے علیحدہ اور جداگانہ تشخص کو برقرار رکھنے کے لیے انہیں بوسنک (Bosnik) کا نام دیے ہوئے انہیں ایک باقاعدہ قوم کے طور پر شناخت دی گئی۔ یعنی بوسنیا کے ایسے باشندے جو کہ بلاشبہ یوگوسلاویہ کی فیڈریشن کا حصہ رہے لیکن اس کے باوجود مذہبی بنیادوں پر اپنی الگ شناخت رکھنے کے حقدار ٹھہرے۔ مسلمانوں کو ان کی مذہبی فرائض کی ادائیگی اور مذہبی تعلیمات پر عمل کی مکمل آزادی دی گئی۔ مساجد کی تعمیر پر کوئی قدغن عائد نہ رکھی گئی۔ اس کے ساتھ ساتھ مارشل ٹیٹو نے یوگوسلاویہ کے تمام علاقوں کو ترقی کے یکساں مواقع فراہم کرنے اور انہیں ترقی کے عمل میں برابری کی بنیادوں پر شریک رکھنے کے لیے مختلف علاقوں میں صنعتی یونٹ، نوکلیئر طاقت کے پلانٹ، اسلحے بنانے کے یونٹ، وغیرہ لگائے۔ بوسنیا کا علاقہ وسیع وعریض ہونے اور سرحدی علاقے سے قریب ہونے کے باعث اس علاقے میں یوگوسلاویہ کے اسلحہ کے بڑے بڑے اسٹور بنائے گئے۔ اس لحاظ سے یوگوسلاویہ کے دفاع میں بوسنیا کو بڑی مرکزی اہمیت حاصل ہوگئی۔ مارشل ٹیٹو کے ان اقدامات کے باعث یوگوسلاویہ کے

تمام علاقے سیاسی عمل میں برابری کی بنیاد پر حصہ لیتے رہے اور بڑی حد تک مطمئن بھی رہے۔

۱۹۹۰ء میں یوگوسلاویہ میں شروع ہونے والی علیحدگی کی تحریکوں میں سب سے پہلے سلووینا کو کامیابی حاصل ہوئی۔ آسٹریا سے مشترکہ سرحد رکھنے والے یوگوسلاویہ علاقوں کو علیحدگی کی اس تحریک میں آسٹریا، جرمنی اور علاقے کے دیگر ممالک کی مکمل حمایت حاصل تھی۔ اس کے بعد علیحدہ ہونے والا علاقہ کروشیا تھا۔ جو کہ اس کے ساتھ واقع تھا۔ اس کی علیحدگی کی تحریک کو بھی یورپ کی کئی قوتوں کی مکمل پشت پناہی حاصل تھی۔ چونکہ یہ تحریکیں مکمل طور پر مقامی افراد کی شمولیت کے باعث لڑی جارہی تھیں اس لیے ان تحریکوں میں کوئی بیرونی عنصر براہ راست حصہ نہیں لے رہا تھا۔ سوائے یورپ کے ان ممالک جو کہ ان کی علیحدگی کی سفارتی حمایت جاری رکھے ہوئے تھے۔ لیکن بوسنیا کا معاملہ سب سے جدا ثابت ہوا۔ سلووینا اور کروشیا کی آبادی کی اکثریت ایک ہی مذہب یعنی عیسائیت کے پیروکار ہیں اس لیے اس لڑائی میں کوئی مذہبی تنازعہ پیش نظر نہ تھا۔ لیکن ان کے مد مقابل بوسنیا ہرزوینا ایک کثیر المذاہب علاقہ تھا جس میں مسلمان ۴۵ فیصد، سربیائی نسل سے تعلق رکھنے والے عیسائی ۳۷ فیصد، کروشیائی نسل سے تعلق رکھنے والے عیسائی ۱۵ فیصد، جبکہ دیگر چھوٹے چھوٹے گروہ بھی شامل تھے۔ اس لحاظ سے بوسنیا میں کسی ایک گروہ، مذہب یا نسل سے تعلق رکھنے والے افراد کے واضح اکثریت نہ تھی۔ بوسنیا کی اس علیحدگی کی تحریک کی قیادت کرنے والے علیجا عزت بیگوچ ایک راسخ العقیدہ مسلمان تھے اور ان کے خیالات و اقدامات سے اس بات کے واضح اشارے مل رہے تھے کہ وہ اس علاقے میں مسلمانوں کی ایک ریاست بنانے کے خواہش مند تھے۔ علیجاہ عزت بیگوچ کی اس سوچ کو دیکھتے ہوئے سربیائی نسل کے عیسائیوں نے جو کہ آبادی کا ۳۷ فیصد پر مشتمل تھے انہوں نے اس اعلان کی مخالفت کردی اور اعلان کیا کہ وہ سربیا کے ساتھ رہنے کے خواہش مند ہیں۔ اس صورت حال نے علاقے میں بے چینی کو جنم دیا اور اعلان آزادی کی مخالفت شروع ہوگئی۔ دوسری طرف سربیا کی حکومت نے بھی بوسنیا کے اعلان آزادی کی بھی مخالفت کردی۔ اس مخالفت کی دیگر وجوہات میں ایک اہم وجہ یہ بھی تھی کہ ایک تو بوسنیا کے جدا ہونے سے سربیا کی سمندر سے رسائی ممکن نہ تھی چونکہ کروشیا کے علیحدہ ہونے سے وہ کئی سو کلومیٹر کی سمندری پٹی سے پہلے ہی محروم ہو چکا تھا اور بوسنیا کی علیحدگی کے بعد وہ سمندر سے مکمل محروم (Land Lock Country) بن جاتا جبکہ دوسری وجہ یہ تھی کہ ٹیٹو کے زمانے میں

یوگوسلاویہ کے اسلحے کے بیشتر ڈپو اس علاقے میں بنائے گئے تھے اور بوسنیا کی علاحدگی کی صورت میں سربیا کو ان سے بھی محروم ہونا پڑتا۔ ان معاملات نے بوسنیا کی علیحدگی کو ایک پیچیدہ مسئلہ بنا دیا۔ لیکن اس مسئلہ کا سب سے خطرناک پہلو بعد ازاں سامنے آیا۔

بوسنیا کی طرف سے علیحدگی کا اعلان ہوتے ہی بوسنیا کے سربیائی نسل کے عیسائیوں نے شدید مخالفت شروع کر دی اور بات احتجاج کے بعد چھوٹے پیمانے کی لڑائی تک جا پہنچی۔ سربیا کی حکومت نے سربیائی نسل کے افراد کی اس مخالفانہ تحریک میں ان کی زبردستی حمایت اور سرپرستی کی۔ اس صورت حال سے یہ بات سامنے آنا شروع ہوگئی کہ شاید یہ کفر و اسلام کی ہے۔ عیسائی مسلمانوں پر حملے کر رہے ہیں۔ واضح رہے کہ ۱۹۹۲ء وہ عرصہ تھا جب امریکہ نے کویت پر عراق کے حملے کے بعد عراق پر حملہ کر دیا تھا اور پورے اسلامی ممالک میں پہلے ہی مغرب مخالف جذبات عروج پر تھے اور اسامہ بن لادن نے امریکی حملے کی مخالفت میں زبردست بیانات دینے پہلے ہی شروع کر رکھا تھا۔ عراق پر امریکی حملے کے بعد اسامہ اپنے خاندان اور القاعدہ کے دیگر اراکین کے ہمراہ سعودی عرب سے سوڈان منتقل ہو گیا تھا۔ کیونکہ امریکہ کی مخالفت کے بعد اس کے سعودی حکومت سے تعلقات انتہائی خراب ہو چکے تھے۔ اسامہ اور اس کی القاعدہ تنظیم نے فوراً ہی بوسنیا میں جاری خانہ جنگی کو مذہبی رنگ دیتے ہوئے اسے عیسائیوں کی طرف سے مسلمانوں کے خلاف جنگ قرار دینے کا پروپیگنڈہ شروع کر دیا۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت تک یہ مسئلہ کسی بھی طور پر مذہبی معاملہ نہ تھا بلکہ درحقیقت علاقائی بنیادوں پر پیدا ہونے والا تصادم تھا۔ اسامہ نے مشرق وسطی اور عراق میں اپنا کوئی کردار نہ دیکھتے ہوئے افغانستان سے لوٹے ہوئے عربی النسل شدت پسندوں کو بوسنیا پہنچ کر عیسائیوں کے خلاف لڑائی میں حصہ لے کر بوسنیائی مسلمانوں کی حمایت کرنے کی تاکید کی۔ اسامہ نے اس تصادم کو صلیبی جنگ سے تشبیہ دیتے ہوئے اسے یورپ میں مسلمانوں کی حکومت قائم کرنے کی طرف پہلی کوشش کا نام دیا۔ اسامہ نے اسے مکمل طور پر جہاد کا نام دے دیا۔ جس میں مسلمانوں کی شرکت لازمی قرار دے دی گئی۔ اسامہ کی اس اپیل کے جواب میں افغان جہاد میں حصہ لینے والے مجاہدین نے اب بوسنیا کو اپنی منزل بنالیا۔ مشرق وسطی سے آنے والے ان مجاہدین کا تعلق کئی عرب ممالک سے تھا جن میں سعودی عرب، یمن، الجزائر، لیبیا، عراق، وغیرہ شامل تھے۔

۲۹ فروری ۱۹۹۲ء میں بوسنیا کی طرف سے اعلان آزادی اور وہاں بوسنیائی اور سربیائی شندوں میں جھڑپیں شروع ہونے کے صرف ایک ماہ بعد ہی اپریل ۱۹۹۲ء میں اسامہ کی ہدایت پر عرب مجاہدین کا پہلا وفد بوسنیا پہنچ گیا۔ اس پانچ رکنی وفد کی سربراہی شیخ ابوعبدالعزیز کر رہا تھا۔ اس وفد میں دیگر شامل مجاہدین بھی قبل ازیں افغان جہاد میں حصہ لے چکے اور اس وفد کے وہاں پہنچنے کا مقصد درحقیقت اس علاقے کی جغرافیہ کا جائزہ لینا اور وہاں جہاد کے لیے ضروری اسلحہ و دیگر ضروریات کا جائزہ لینا تھا تاکہ ان ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے مزید انتظامات کیے جاسکیں۔

اس وفد نے بیشتر علاقے کا ہنگامی بنیادوں پر دورہ کر کے ضروریات کا تخمینہ لگایا اور دو ماہ کے اندر مزید سینکڑوں عرب مجاہدین یہاں جہاد میں حصہ لینے کے لیے پہنچ گئے۔ شیخ عبدالعزیز نے اپنے نام کے ساتھ 'بار بروسا' کا اضافہ کر دیا۔ یاد رہے بار بروسا سلطنت عثمانیہ کا وہ امیر البحر تھا جس نے یورپ میں عثمانوی فوج کو کامیابی دلوانے میں بڑا اہم کردار ادا کیا تھا۔ اضافی مجاہدین کی آمد کے بعد بوسنا میں مجاہدین کی تعداد میں خاصا اضافہ ہو چکا تھا۔ اسامہ نے مجاہدین کو ایک نظم و نسق میں لانے کے لیے شیخ عبدالعزیز کو بوسنیا میں مجاہدین کا پہلا امیر مقرر کیا۔ اسے کمانڈر انچیف کی ذمہ داریاں بھی سونپ دی گئیں۔ شیخ عزیز نے اپنا ہیڈ کوارٹر ترنیک (Travnik) شہر میں قائم کیا جبکہ مشرق وسطی اور دیگر علاقوں سے آنے والے رضا کاروں کی تربیت کے لیے ایک مرکز میوری (Mehurici) کے مقام پر قائم کیا گیا۔ اس بات کے لیے بھی خصوصی کوششیں کی گئیں کہ بوسنیا کے مقامی مسلمانوں میں جذبہ جہاد پیدا کرنے اور اس لڑائی میں حصہ لینے کے لیے کام کیا جائے۔

جہاد کے اس کام کو مزید مربوط اور سائنٹفک شکل دینے کے لیے ایک تفصیلی اور مربوط نظام ترتیب دیا گیا۔ اور بڑی سوچ و وچار کے بعد تین مختلف ونگ بنائے گئے ہیں جن کو اس کام کو آگے بڑھانے کی ذمہ داریاں سونپی گئیں۔ پہلے ونگ کا کام بوسنیا کے لیے جہاد کے لیے چندہ اکٹھا کرنا تھا۔ یہ ونگ مختلف ممالک میں چندہ اکٹھا کرنے کے لیے پروپیگنڈہ اور دیگر ہتھکنڈے استعمال کرتے رہے۔ اس سلسلے میں شائع کیے جانے والے ایک پمفلٹ کی نقل یہاں دی جارہی ہیں۔

اس ونگ نے اپنے پروپیگنڈہ طریقوں کے ذریعے پوری دنیا سے کروڑوں کا چندہ اکٹھا کیا۔ دوسرے ونگ کا کام یورپ کے مختلف علاقوں میں موجود دیگر اسلامی اور انتہا پسند تحریکوں سے

روابط استوار کرنا تھا تا کہ بعد ازاں بوسنیا کی تحریک کو یورپ کے دیگر علاقوں تک بھی پھیلایا جا سکے۔ جبکہ تیسرے ونگ کا کام بوسنیا میں جاری جہاد کے کام کو جاری رکھنا تھا۔ ان تینوں ونگز کی ذمہ داریاں مختلف افراد کو سونپی گئیں۔ مثلاً ابتدائی دنوں میں نئے بھرتی ہونے والے رضا کاروں کی تربیت کی ذمہ داری الحاج بودیلہ کے ذمہ لگائی گئی جس کا تعلق الجزائر سے تھا اور اس سے قبل وہ افغان جہاد میں متحرک کردار ادا کر چکا تھا۔ جبکہ وہ ونگ جس کے ذمہ یورپ کی دیگر تنظیموں کے درمیان رابطہ کاری کی ذمہ داری سونپی گئی تھی اس کی سربراہی شیخ انور شعبان کے ذمہ لگائی گئی تھی۔ شعبان ایک مصری نژاد باشندہ تھا جو کہ بڑے طویل عرصے سے اٹلی کے شہر میلان میں رہائش پذیر تھا اور وہاں کے اسلامی ثقافتی مرکز میں امامت کی ذمہ داریاں نبھا رہا تھا۔ جبکہ تیسرے ونگ جس کا کام چندہ اکھٹا کرنا تھا اس کی ذمہ داری سعودی عرب سے تعلق رکھنے والے ایک شدت پسند شیخ عمر عبدالرحمٰن کو دی گئی۔ شیخ عمر اور اس کے حلقے کے دیگر افراد اس جہادی کام کے لیے کافی چندہ اکھٹا کرنے میں کامیاب ہوئے۔ انہوں نے اس مقصد کے لیے کروشیا کے مرکزی شہر زگرب (Zagreb) میں ایک دومنزلہ جدید عمارت بھی حاصل کی جس میں اس کام کو بڑے سائنسی انداز میں انجام دینے کا بندوبست بھی کیا گیا تھا۔ چندہ اکھٹا کرنے والے اس ادارے کا نام 'الکیف' رکھا گیا۔ اندازہ ہے کہ انہوں نے کم از کم ۳۵۰ ملین ڈالر کی رقم اس مقصد کے لیے اکھٹی کی۔

اس جہاد میں حصہ لینے کے لیے دیگر شدت پسندوں کے ساتھ ساتھ کئی اہم کمانڈر بھی شریک ہوئے جو کہ قبل ازیں افغان جہاد میں حصہ لے چکے تھے۔ ان میں محمد بن ابراہیم سیدانی، وحیدالدین مصری اور موناذ باللہ جیسے کئی کمانڈر شامل تھے۔

اسامہ بن لادن اور القاعدہ کے لیے بوسنیا کا جہاد کئی لحاظ سے اہم تھا۔ اسامہ کا خیال تھا کہ بوسنیا کو مرکز بنا کر تمام یورپ میں اسلامی تحریک اور جہاد کے کام کو آگے بڑھایا جا سکتا ہے۔ اس لیے اس نے اس جہاد کی مکمل نگرانی کسی عام مجاہد لیڈر کے حوالے کرنے کے بجائے یہ کام اپنے ماموں زاد ابوزبیر المدنی کے حوالے کیا۔ وہ اس سے قبل اس کے ساتھ افغان جہاد میں شریک ہونے کے علاوہ اب سوڈان میں بھی اس کے ساتھ تھا اور مشرقی افریقہ میں امریکی سفارت خانوں پر حملے کی خود نگرانی کر چکا تھا۔ کینیا اور نائیجریا میں تخریبی کارروائیوں میں اس کا کردار کافی اہم تھا۔ زبیر نے اپنے گرد انتہائی اہم شدت پسندوں کا ایک حلقہ بنایا جس کو قافلہ شہدا کا نام دیا جو کہ

اس کی زیر قیادت ہر قسم کی کاروائی میں حصہ لینے کے لیے ہمہ وقت تیار تھے۔ زبیر نے اس کام کے لیے اپنا مرکزی دفتر بوسنیا کے دارالحکومت سراویو کے قریب سب سے اونچی پہاڑی چوٹی ماؤنٹ اگمان (Mount Igman) پر قائم کیا۔ آٹھ ہزار فٹ کی بلندی پر بنایا جانے والا مرکز ایک محفوظ ترین جگہ تصور کی جاتی تھی۔

ان عرب نژاد مجاہدین نے یہاں پہنچ کر ایک طرف تو سربوں کے خلاف لڑائی میں حصہ لینا شروع کر دیا تو دوسری طرف بوسنیا کے مسلمانوں کو سلفی اسلام کی طرف راغب کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ ان کی نظر میں صرف سخت گیر اور رجعت پسند اسلامی روایات ہی اسلامی شعار کی علامت تھیں۔ انہوں نے بوسنیا کے مسلمانوں کے رہن سہن اور ثقافت کو غیر اسلامی تصور کرتے ہوئے انہیں 'سلفی' اسلامی روایات کے قریب لانے کے لیے سختی شروع کر دی۔ خواتین کو پردہ کرنے اور مردوں کو اسلامی لباس اختیار کرنے کے لیے تلقین شروع ہوئی۔ بوسنیا میں خوراک کے لیے استعمال کی جانے والی کئی اشیاء کو غیر اسلامی قرار دیتے ہوئے ان کے استعمال پر پابندی عائد کر دی گئی۔ سربوں کے کئی علاقے قبضہ کرنے کے بعد اس علاقے کے چرچوں کو یا تو مسمار کر دیا گیا یا پھر ان کو مساجد میں تبدیل کرنے کی کوششیں کی جانے لگیں۔ غیر مسلموں کی خوراک کا حصہ بننے والے کئی جانور جن کا استعمال اسلامی روایات کے مطابق جائز نہیں، انہیں گولیوں سے بھون دیا جاتا۔ اس قسم کی حرکتوں نے ان گرضا کار مجاہدین کو بوسنیا کے مسلمانوں میں مقبول کرنے کے بجائے انہیں عام مسلمانوں سے متنفر کر دیا جس کے باعث وہ عوام میں مقبولیت حاصل نہ کر سکے۔

ان عرب نژاد مجاہدین نے اپنے جہاد کے لیے چندہ اکٹھا کرنے کے لیے کئی عالمی تنظیموں اور فلاحی اداروں مثلاً UNHCR، ریڈ کراس اور IRC وغیرہ کے لیے کام کرنے والے کئی فلاحی اہلکاروں کو اغوا کر لیا اور ان کی رہائی کے عیوض بھاری تاوان کی رقم کے مطالبے شروع کر دیئے۔ تواتر سے ایسے واقعات ہونے کے باعث کئی بین الاقوامی فلاحی اداروں نے اس علاقے میں اپنے کام بند کر دیا اور یہاں سے منتقل ہو گئے ان کے چلے جانے کی وجہ سے سب سے متاثر ہونے والوں میں خواتین، بچے، بوڑھے اور لڑائی کے باعث معذور ہو جانے والے افراد ہوئے جن کو بڑی امداد اور مدد ان اداروں سے حاصل ہو رہی تھی۔ بین الاقوامی اداروں سے ملنے والی

بند ہو جانے سے بوسنیا کی آبادی ان مجاہدین سے مزید خائف ہوگئی۔ ان مجاہدین نے اپنے زیر نگین علاقوں میں شراب، سگریٹ دیگر اشیاء کے استعمال پر بھی بڑی سختی سے پابندی عائد کردی۔ مجاہدین کی ان حرکتوں نے انہیں عوام میں غیر مقبول بنا دیا۔

بوسنیا کی صورتحال ہر گزرتے ہوئے دن کے ساتھ بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔ ابتداء میں اس بات کا اندازہ نہ کیا جاسکا کہ اس لڑائی میں بیرونی افراد بھی ملوث ہیں۔ لیکن ۱۹۹۴ء کے اوائل میں اس بات کے اشارے ملنے لگے کہ بوسنیا کے شہریوں سے زیادہ بہت بیرونی مجاھد ین اور تنظیمیں سے افراد اس معاملے میں مداخلت کررہے ہیں۔ جس کے باعث مغربی دنیا نے غیر ملکی مداخلت کے خلاف آواز اٹھانا شروع کردی لیکن اس لڑائی کا سب سے زیادہ اور قابل ذکر واقعہ جس نے اس تصادم کو بالکل ہی ایک نئی صورت دی وہ تھا جولائی ۱۹۹۵ء میں سربیانیکا کا قتل عام۔ کہا جاتا ہے کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد یہ یورپ میں قتل عام کا سب سے بڑا واقعہ ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ سربوں کے ہاتھوں ہونے والے اس قتل عام کے ۸۰۰۰ مسلمان مردوں اور لڑکوں کو قتل کیا گیا جو کہ مسلمانوں کی نسل کشی کرنے کی کوشش تھی۔ اس علاقے کے بیشتر تمام مسلمان مرد اور لڑکوں کو قتل کردیا گیا جبکہ خواتین کی عصمت دری کی گئی۔ اس قتل عام کے نتیجے میں ہلاک ہونے والے افراد کے متعلق متضاد معلومات اور اعداد و شمار فراہم کیے گئے۔ ایک اندازے کے مطابق آٹھ ہزار مسلمانوں کو قتل کرکے ان کی لاشوں کو گڑھوں میں ڈال کر ان کی اجتماعی قبریں بنادی گئیں۔ اسی صورتحال میں بوسنیائی مسلمانوں، اور سربیائی باشندوں کے درمیان کھلی لڑائی شروع ہوگئی جس میں بڑی تباہی و بربادی ہوئی۔ حالات کی سنگینی کا اندازہ کرتے ہوئے بیرونی ممالک خصوصاً امریکہ کو مداخلت کرنا پڑی۔ امریکہ نے رچرڈ ہلبورک کو اس علاقے کے لیے اپنا خصوصی مشیر بنا کر بھیجا۔ ہلبورک نے انتہائی پیچیدہ صورت حال میں ڈپلومیسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے علاقے میں جنگ بندی کرائی اور صورت حال کو معمول پر لانے کی کوششیں کیں۔ جنگ بندی کے ساتھ ہی نیٹو اور اقوام متحدہ کی امن فوجوں کو علاقے میں تعینات کیا گیا تاکہ لڑائی کو کنٹرول کیا جاسکے۔ ان اقدامات کے نتیجے میں بالآخر لڑائی کو روکا جاسکا۔ جنگ بندی کے معاہدے میں یہ بات خصوصی طور پر رکھی گئی کہ جنگ بندی کے ساتھ ہی تمام غیر ملکی مجاہدین فری طور پر یہ علاقہ خالی کردیں گے۔ عوام میں غیر مقبول ہونے کے باعث ان عرب نژاد باشندوں کو بالآخر یہ علاقہ چھوڑنا پڑا۔

بوسنیا کی یہ خانہ جنگی کئی اہم امور کو سامنے لائی۔ اول تو یہ کہ یہ علاقائی مسئلہ تھا جس کے پس پشت کئی عوامل کارفرما تھے جن میں سے چند کا بالائی سطور میں ذکر کیا گیا جس کا مذہب سے دور دور کا واسطہ نہ تھا۔ لیکن اسے نامعلوم وجوہات کی بناء پر مذہبی رنگ دینے کی کوشش کی گئی جسنے صورتحال کو مزید گھمبیر بنا دیا۔ ک اس معاملے کا دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ بوسنیا کی رجعت پسند قیادت اور خاص طور پر علیجاہ عزت بیگوچ نے صورتحال کا صحیح تناظر میں جائزہ نہ لیا اور کوتاہ بینی کا مظاہرہ کرتے ہوئے عرب نژاد جنگجوؤں اور شدت پسندوں کو بلاوجہ اس معاملے میں کودنے کی اجازت دے دی۔ جس کی وجہ سے تنازعہ زیادہ گھمبیر صورت اپنا گیا۔ بوسنیا کی حکومت اس حد تک آگے چلی گئی کہ کئی عرب نژاد افراد کو بوسنیا کی شہریت کے کارڈ اور پاسپورٹ تک جاری کر دیئے گئے تا کہ انہیں یورپ کے دیگر قریبی ممالک میں آنے جانے میں دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ ان عرب مجاہدین نے جہاں ایک طرف سربیائی باشندوں سے اس بنیاد پر لڑائی لڑنا شروع کی کہ وہ عیسائی ہیں اور ان کا جھگڑا بوسنیائی مسلمانوں سے ہے اور دوسری طرف انہوں نے بوسنیا کے مقامی مسلمانوں کو اس لیے نشانہ بنانا شروع کر دیا کہ ان کا اسلام روشن خیال تھا اور عرب مجاہدین کے سلفی اور رجعت پسندانہ اسلام سے مطابقت نہیں رکھتا تھا۔ عرب مجاہدین کی اس رجعت پسندی اور سخت گیر پابندیوں نے انہیں بوسنیا کے عام مسلمانوں میں انتہائی غیر مقبول بنا دیا۔ امریکہ کی طرف سے بوسنیا کے اس تنازعے میں بڑی دیر سے جا کر مداخلت کرنے کی وجہ سے پس پشت وجوہات میں سب سے اہم وجہ یہ تھی کہ امریکہ کے خفیہ اداروں کو اطلاعات مل رہی تھیں کہ عرب مجاہدین کے ساتھ ساتھ اب ایران کے حمایت یافتہ حزب اللہ کے مجاہدین بھی بوسنیا کی طرف رخ کرنے کی منصوبہ بندی ترتیب دے رہے ہیں۔ ان خفیہ اطلاعات نے امریکہ میں پریشانی کی ایک لہر دوڑا دی اور سی آئی اے اس بات کو شدت سے محسوس کرنے لگی کہ اگر اس معاملے کا فوری حل نہ نکالا گیا تو کہیں ایران چیزوں کو کنٹرول کرنا شروع نہ کر دے۔

وجوہات چاہے کوئی بھی ہو بہر حال بوسنیا کا مسئلہ کئی ان کہی باتیں اپنے ساتھ چھوڑ گیا اور اس تنازعے سے کئی ممالک کو بہت سے سبق سیکھنے کا موقع بھی ملا۔ کچھ ممالک بشمول خود بوسنیا نے بہت کچھ سیکھا لیکن چند ممالک جن میں پاکستان سمیت کئی ممالک مثلاً سوڈان، نائیجیریا بھی شامل ہیں انہوں نے کوئی عبرت حاصل نہ کی جس کے باعث یہ ممالک آج بھی مشکلات میں گھ

ہوئے ہیں۔

بوسنیا نے اس جنگ کے اختتام پر نہ صرف تمام غیر ملکی جنگجوں کو ملک سے نکال باہر کیا بلکہ پرانی روایات کے عین مطابق مذہب کو ریاستی امور سے جدا کرتے ہوئے یورپ کی سیکولر روایات کو دوبارہ اپنے یہاں جاری رکھا جس کے باعث تصادم کی صورتحال کو روکنے میں مدد مل سکی جبکہ پاکستان جیسی ریاست نے لاکھوں کی باقاعدہ فوج ہونے کے باوجود دفاعی مقاصد کے لیے ہمیشہ جنگجوؤں اور مذہبی شدت پسندوں کو ایک اہم ہتھیار کے طور پر استعمال کیا۔ جس کے باعث یہ مذہبی جنونی اور شدت پسند اس قدر طاقتور ہو گئے کہ بالآخر انہوں نے خود پاکستان کے عسکری اداروں اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کو نشانہ بنانا شروع کر دیا جس کے نتیجے میں نہ صرف ۵۰۰۰ سے زائد فوجی، پولیس اور دیگر اہلکار ہلاک ہوئے بلکہ ۳۵۰۰۰ عام شہریوں کو بھی تخریبی کارروائیوں میں حدف بنایا گیا۔ ان معصوم اور بے گناہ شہریوں کو بلا جواز مارکیٹوں، تفریحی مقامات، عبادت گاہوں، دوران سفر اور ہسپتالوں تک میں نشانہ بنایا گیا۔ پاکستان کے صاحبان اقتدار کے لیے لمحہ فکریہ یہ ہے کہ اب وہ اس بات پر غور کریں کہ مذہب کو ریاستی معاملات میں داخل کر کے وہ رموز ریاست کی ضروریات پوری نہیں کر رہے ہیں بلکہ وہ اس ملک اور اس ملک کے عوام کے ساتھ زیادتی کر رہے ہیں جس کے نتائج پاکستان کے لیے کسی بھی طرح مثبت نہیں ہو سکتے۔

اس مذہبی انتہا پسندی کے نتیجے میں پاکستان میں ہونے والی تخریبی کاروائیوں کے باعث ملک عدم استحکام کا شکار ہو رہا ہے۔ جس کے نتیجے میں پاکستان کو ایک ناکام ریاست تصور کیا جانے لگا ہے اور اس کا انداز سال ۲۰۱۲ء میں ناکام ریاستوں کی جاری ہونے والی فہرست سے لگایا جا سکتا ہے جس کے مطابق پاکستان اس فہرست میں بارہویں نمبر پر ہے جو کہ اس بات کا اشارہ دیتا ہے کہ پاکستان کی ریاست بڑی خطرناک صورت حال کی طرف بڑھ رہی ہے جبکہ اس کے مقابل سابقہ یوگوسلاویہ سے علیحدگی اختیار کرنے والی ریاستیں جو کہ صرف ایک دھائی قبل تک غیر یقینی، اندرونی جھگڑوں اور عدم استحکام کا شکار تھیں آج وہ ریاستیں بڑی کامیابی سے ترقی کی راہ پر گامزن ہیں۔ ان جدا ہونے والی ریاستوں میں بوسنیا جو کہ اس لڑائی میں سب سے زیادہ متاثر علاقہ قرار پایا وہ ناکام ریاستوں کی فہرست میں ۷۰ ویں نمبر پر ہے جبکہ سربیا کا نمبر ۹۸ ویں ہے۔ اسی طرح کروشیا ۱۳۲ اور سلوینا ۱۵۶ نمبر پر ہے۔ اس تقابلی جائزہ سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ پاکستان کو

ریاستی امور سے مذہب کو جدا کر کے ایک سیکولر ریاست کی طرف گامزن ہونا پڑے گا۔

سربیا کینکا کے قتل عام کے متعلق حالیہ برسوں میں سامنے آنے والی تحقیق نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ اس قتل عام کے متعلق بے جا پروپیگنڈہ کیا گیا۔ دیگر تحقیق کے ساتھ ساتھ گذشتہ برس سب سے اہم تحقیقی کام ایڈورڈ ہرمین (Edward Herman) کا سامنے آیا۔ ہرمین نے اس سے قبل نوم چومسکی کے ساتھ مل کر مشترکہ طور پر ایک کتاب تحریر کی جو کہ ابلاغ عامہ کے متعلق تھی جب اپنی حالیہ اس تحقیقی کتاب The Politics of Genocide میں اس نے اس بات پر بڑی تفصیلی بحث کی ہے کہ بے شک سربیکا نکا میں ۸۰۰۰ افراد قتل کیے گئے اور کئی افراد کے بعد ازاں DNA ٹیسٹ نے یہ ثابت کر دیا کہ ان قتل ہونے والے افراد کی اکثریت کا تعلق مسلمانوں سے تھا لیکن اس سے کہیں یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ہلاک کیے جانے والے تمام افراد سربیا کی فوجوں کی جارحیت کا نشانہ بنے کیونکہ کئی افراد ایسے بھی تھے جو کہ آپس کی لڑائیوں میں بھی ہلاک ہوئے۔

حوالہ جات:

Herman, E. (2011). The Politics of Genocide. Monthly Review Press

Herman, E. (2005). The Politics of Srebrenica Massacre, retrieved on June 5, 2012 from http://www.zcommunications.org/the-politics-of-the-srebrenica-massacre-by-edward-herman

Kohlmann, E.F. (2004). Al-Qaida's Jihad in Europe- The Afghan- Bosnian Network. New York: Berg

Kepel, G. (2002). Jihad- The Trails of Political Islam. London; I.B.Tauris.

Granda, S (2008). Slovenia- A Historical Overview. Ljubljana.

☆☆☆

جنگ اور ذرائع ابلاغ

مقتدا منصور

جنگ وجدل میں ذرائع ابلاغ کے کردار کا مطالعہ کرنے سے قبل ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ جنگ کا سبب کیا ہوتا ہے؟ اس میں تنازعات کا کیا کردار ہوتا ہے؟ جنگ بازی کی نفسیات کے فروغ میں درباروں، حکومتی ایوانوں نے متعلق علماء، ادباء اور محققین کا کیا کردار ہوتا ہے؟ قومی پرستانہ، نسلی، لسانی، مذہبی اور فرقہ وارانہ تفاخر کا کیا کردار ہوتا ہے؟ اس کے بعد یہ تقابلی جائزہ لینے کی بھی ضرورت ہے کہ آیا بیسویں صدی کے نصف آخر یعنی دوسری عالمی جنگ کے خاتمے کے بعد جب ذرائع ابلاغ تیزی کے ساتھ ترقی کر رہے تھے، ذرائع ابلاغ نے جنگ باز ذہنیت کو پروان چڑھانے میں زیادہ سرعت دکھائی یا امن کی کوششوں کو پروان چڑھانے میں زیادہ فعال کردار ادا کیا؟

ہم دیکھتے ہیں کہ دوسری عالمی جنگ کے بعد صحافت برائے جنگ کی بجائے صحافت برائے امن کا مظہر (Phenomenon) صحافتی حلقوں میں زیادہ مقبول ہوا ہے۔ کیونکہ دنیا کی بیشتر صحافتی تنظیموں نے اپنے اراکین کی تربیت میں جنگ کی کوریج کا طریقہ کار ضرور سمجھایا، مگر امن کے پہلو کو زیادہ اجاگر کرنے کی کوشش کی۔ یہی سبب ہے کہ عالمی صحافتی تنظیموں نے دوسری عالمی جنگ کے بعد دنیا کے مختلف خطوں میں ہونے والی جنگوں، علاقائی تنازعات، خانہ جنگیوں اور قبائلی تصادم کی کوریج کرتے وقت پرامن بقائے باہمی کے پہلو کو مدنظر رکھا اور جنگ وجدل کے بارے میں مبالغہ آرائی اور جنگی جذبات کو ابھارنے کی بجائے امن کا راستہ ہموار کرنے میں اپنا حصہ ڈالنے کی کوشش کی۔ اسلئے یہاں ہم جنگ وجدل کی کوریج کی تاریخ کا سرسری مطالعہ کرتے

ہوئے ذرائع ابلاغ کے جنگ مخالف کردار پر روشنی ڈالنے کی کوشش کریں گے۔

تنازعات کیا ہوتے ہیں؟

ایک دوسرے پر غرانا، بھنبھوڑنا اور کاٹ کھانا حیوانی جبلت ہے، جو انسانوں میں دیگر حیوانی جبلتوں کی طرح بدرجہ اتم موجود ہے۔ مگر جب سے انسان نے عقلی، فکری اور سماجی زندگی کا آغاز کیا ہے، تو اس نے اپنی زندگی کے بہت سے معاملات و مسائل کو جہاں احسن طریقہ سے حل کرنے اور ان گنت سہولیات سے فیضیاب ہونے کی کوشش کی ہے، وہیں نقطہ نظر کے اختلاف کو دشمنی کی شکل دینے اور اسکے نتیجے میں پیدا ہونے والے تنازعات کو طاقت کے ذریعہ حل کرنے کا رجحان بھی پروان چڑھا ہے۔ گو کہ انسانوں میں اختلافات اور تنازعات کی نوعیت جانوروں مختلف ہوتی ہے، مگر ردعمل جانوروں جیسا ہی ہوتا ہے۔

اختلافات کا پیدا ہونا فطری عمل ہے، جو چاہے دو افراد کے درمیان میں ہوں یا سماج کے مختلف طبقات کے درمیان، یا پھر مختلف اقوام یا ممالک کے درمیان ہوں۔ پر امن حل پر متفق نہ ہونے کی صورت میں یہی اختلافات تنازع کی شکل اختیار کرتے ہیں، جو دنگا فساد سے ہوتے ہوئے مسلح تصادم اور بالآخر جنگ و جدل پر منتج ہوتے ہیں، جس کا نقصان دونوں فریقوں کو اٹھانا پڑتا ہے، چاہے وہ دو افراد ہوں، دو قبائل ہوں یا دو ممالک۔ مگر یہ سب جاننے کے باوجود انسان اپنی اس حیوانی جبلت پر قابو پانے میں ناکام ہے۔

تنازعات کے چند بنیادی اسباب:

تنازعات انسانی سماج کی انتہائی نچلی سطح سے عالمگیر سطح تک پھیلے ہوئے ہیں۔ ان تنازعات کی شدت کا انحصار ان کی نوعیت پر ہوتا ہے، جو درج ذیل ہیں:

☆ مقامی نوعیت کے تنازعات عام طور پر زن، زر اور زمین کے حوالے سے پیدا ہوتے ہیں، اس کے علاوہ قبائلی شناخت اور تفاخر بھی تنازعات کا سبب بنتے ہیں، جو مسلح تصادم کی شکل اختیار کرتے ہیں، جس میں جان و مال کا نقصان ہوتا ہے، مگر حل نہیں ملتا۔

☆ قومیتی یا گروہی تنازعات: عام طور پر کسی ایک ملک کے اندر آباد مختلف قومیتوں اور گروہوں کے درمیان باہمی تنازعات اس وقت جنم لیتے ہیں، جب معاشرے کے مختلف دھڑوں کے درمیان سیاسی، سماجی، معاشی اور ثقافتی مفادات کا ٹکراؤ پیدا ہو جائے۔ کسی ایک نسلی یا لسانی گروہ کا دوسرے لسانی گروہ کیلئے تحقیر و توہین کا رویّہ ان کے درمیان تصادم کی راہ ہموار کرتا ہے۔ اسی طرح مختلف مسالک اور عقائد کے درمیان کسی ایک گروہ کا نظریاتی بنیادوں پر تفاخر اور بالادستی کا تصور اور دوسرے عقائد کے ماننے والوں کی تحقیر و تکفیر تصادم کا سبب بنتی ہے۔

☆ قومی تنازعات: کسی ملک یا معاشرے میں مختلف لسانی، نسلی یا قومیتی گروہوں کی ریاست سے ناراضگی اور اس پر عدم اعتماد کا بنیادی سبب وسائل کی غیر منصفانہ تقسیم، آزادیٔ اظہار پر بے جا پابندیاں اور بنیادی انسانی حقوق کا سلب کیا جانا ہیں۔ قومی سطح پر ریاست کی مقتدر اعلیٰ کا غیر مناسب اور جانبدارانہ رویّہ اور قومیتی گروہوں کے جائز مطالبات پر توجہ دینے کی بجائے ان کے ساتھ سخت گیری کا برتاؤ ان قومیتی گروہوں کو ریاست کے ساتھ متصادم ہونے پر مجبور کرتا ہے۔ اسی طرح ریاست کے اندر مختلف نسلی، لسانی یا مذہبی گروہوں کے درمیان تصادم جنگ جیسی شکل اختیار کر لیتا ہے، جسے عموماً خانہ جنگی کہا جاتا ہے، جس میں ریاست کی رٹ بالکل ختم ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ 1971ء میں سابقہ مشرقی پاکستان میں ہوا اور اب بلوچستان میں ہو رہا ہے۔

☆ علاقائی تنازعات: دو یا دو سے زائد ممالک کے درمیان جغرافیائی تقسیم، کسی خطے یا علاقے پر دونوں کا دعویٰ، قدرتی وسائل جیسے دریائی پانیوں یا پہاڑی سلسلوں کی تقسیم پر اختلاف اور تجارتی مفادات کے حوالے سے جنم لینے والے مسائل تنازع کی شکل اختیار کرتے ہیں، جو پرامن طریقہ سے حل نہ ہونے کی صورت میں جنگ و جدل تک جا پہنچتے

ہیں۔جس کے نتیجے میں دونوں ممالک کو جان و مال اور وسائل کا شدید نقصان اٹھانا پڑتا ہے اور اس کے بعد جنگ میں شریک ممالک کی معاشی اور سماجی ترقی بھی کئی برس تک متاثر رہتی ہے۔

جنگ بازی اور آلات حرب کا ارتقاء:

بعض انسانوں کی فطرت پر حیوانی جبلت یا جنگ باز ذہنیت حاوی ہوتی ہے، اسلئے وہ ہر مسئلے کو طاقت کے بل بوتے پر حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔جس طرح تاریخ کے مختلف ادوار میں تخلیق کار انسانوں کا ایک گروہ انسانی زندگی میں سہولیات فراہم کرنے اور انہیں مواصلات، رہن سہن اور مختلف امراض سے بچاؤ کیلئے ادویات ایجاد کرنے میں منہمک رہا۔دوسری طرف جنگ باز ذہنیت کا حامل انسانوں کا ایک گروہ انفرادی اور اجتماعی تحفظ کے نام پر آلات حرب کو مزید مہلک اور حساس بنانے میں مصروف رہا۔یہی سبب ہے کہ درختوں کی شاخوں اور پتھروں سے ایک دوسرے کا سر پھوڑنے والے انسان نے تیر، تلوار، نیزے، بھالے اور توپ وتفنگ سے ہوتے ہوئے آج انسان جوہری ہتھیار تک ایجاد کر لئے، جو لمحہ بھر میں ہزاروں افراد کو لقمہ اجل اور پورے علاقے کو خاکستر کر دیتے ہیں۔آج دنیا کی بقاء کو سب سے بڑا خطرہ انہی مہلک جوہری ہتھیاروں سے ہے۔اسوقت پوری دنیا میں تقریباً 5 کروڑ افراد اسلحہ سازی کی صنعت سے وابستہ ہیں اور 10 لاکھ کے قریب سائنس دان آلات حرب کو مزید حساس اور مہلک بنانے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔

جنگ اور تنازعات کی کوریج:

جنگوں کی رپورٹنگ کی تاریخ خاصی پرانی ہے۔دنیا کی معلوم تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ بادشاہوں اور شہنشاہوں کو اپنی کامیابیاں اور کامرانیاں رقم کرانے کا جنون کی حد تک شوق ہوا کرتا تھا۔وہ چاہتے تھے کہ ان کی حکمرانی کا احوال آنے والی نسلوں تک پہنچے اور ان کی ہمت، جرأت اور فتح مندیوں کی داستانیں زبان زدِ عام ہوں۔یہی سبب ہے کہ تاریخ نویسی شاہی درباروں اور حکومتی ایوانوں کا محبوب مشغلہ ہوا کرتا تھا۔ابتدائی زمانوں میں مورخ یا وقوع نگار خود

بہت کم میدان جنگ میں جاتے تھے، بلکہ وہ کسی جنگی مہم کے کامیاب خاتمہ کے بعد اس میں شریک کمانداروں اور سپاہیوں سے اس مہم جوئی کا احوال سن کر اپنی طرف سے مبالغہ آمیزی کے ساتھ اس رزمیہ داستان کو رقم کیا کرتے تھے، جس میں بادشاہ دانشمندی، کمانداروں کی ہوشیاری اور سپاہیوں کی بے جگری کی داستانیں بیان کی جاتی تھیں۔ یہ جنگی تاریخ نویسی یا جنگی صحافت کا مبہم سا آغاز تھا۔

جدید دنیا میں ایک ڈچ پینٹر ولیم وان ڈی ویلڈے Willem van de Velde کو پہلے جنگی صحافی ہونے کا اعزاز حاصل ہے، جس نے 1653ء میں برطانیہ اور ہالینڈ کے درمیان بحری جنگ کا ایک چھوٹی سی کشتی میں بیٹھ کر مشاہدہ کیا اور دن بھر کی اس جنگ کی پینٹنگز بنائیں۔ واپسی پر بعض اہلکاروں کی فرمائش پر اس نے اس جنگ کا احوال بھی تحریر کیا، جو اس کے اپنے مشاہدے پر مبنی تھا، جسے ہالینڈ کے ایک جریدے نے شائع کیا۔ جنگ کی کوریج کے حوالے سے دوسرا اہم نام ہنری کریب روبن سن Henry Crabb Robinson کا ہے، جس نے انیسویں صدی کے اوئل میں ایک پہاڑی پر بیٹھ کر جرمنی کے خلاف نپولین کی جنگ کا مشاہدہ کیا اور اس جنگ کا احوال دی ٹائمز لندن میں قسط وار شائع کیا۔

پہلی عالمی جنگ کے موقع پر برطانوی اور فرانسیسی کمانڈروں کا موقف تھا کہ صحافیوں کو محاذ جنگ تک جانے سے روکا جائے، کیونکہ اول تو ان کی رپورٹس عوام میں مایوسی پھیلانے کا سبب بن سکتی ہیں، دوئم فوج جنگ میں مصروف ہو یا ان کے تحفظ کرے۔ امریکا نے بھی صحافیوں کے میدان جنگ کے قریب جانے اور چھوٹے افسران اور سپاہیوں سے ملنے پر پابندی عائد کردی تھی۔ صحافیوں کو صرف کیمپ آفسوں تک جا کر کمانڈروں سے رپورٹ لینے کی اجازت دی گئی تھی، جنہیں سخت سنسر کے بعد شائع کیا جاتا تھا۔ اسلئے پہلی عالمی جنگ کے بارے میں جتنی رپورٹس شائع ہوئی ہیں، وہ حکومت کی پریس ریلیزوں اور کمانڈروں کے بیانات اور ان کی طرف سے مہیا کردہ تصاویر پر مبنی تھیں۔ چونکہ انیسویں صدی کے آخر تک ٹیلے گراف متعارف ہو چکا تھا، اسلئے صحافیوں کو اپنی رپورٹس بھیجنے میں سہولت میسر آ گئی تھی۔ لہٰذا دوسری عالمی جنگ کی بیشتر رپورٹس جائے وقوع کا چشم دید احوال اور شائع ہونے والی بیشتر تصاویر حقیقی ہیں۔ اسکی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ دوسری عالمی جنگ کے موقع پر اتحادی ممالک کے حکمرانوں اور فوجی جرنیلوں کا رویہ پہلی عالمی جنگ کے مقابلے

میں خاصا مختلف ہو چکا تھا اور انہیں ذرائع ابلاغ کی اہمیت کا اندازہ تھا۔ یہی سبب تھا کہ اکثر کمانڈر خود صحافیوں کو اگلے مورچوں تک لے جاتے تھے اور ان سے قبضہ کئے گئے علاقوں کی تصاویر بنانے کی خواہش ظاہر کرتے۔ دوسری عالمی جنگ کے دوران رالف برنس Ralph Barnes وہ پہلا صحافی ہے، جو محاذ جنگ پر رپورٹنگ کرتے ہوئے 1940ء میں مارا گیا۔ اس کے علاوہ کئی صحافیوں اور فوٹو گرافروں نے اگلے مورچوں سے جنگ کی رپورٹنگ اور تصویر کشی کی، ان میں سے کئی زخمی بھی ہوئے۔

دوسری عالمی جنگ کے بعد ٹیلے کمیونی کیشن ٹیکنالوجی نے بہت تیز رفتاری کے ساتھ ترقی کی اور ہر سال دو سال بعد نئے اور حساس آڈیو ویڈیو ریکارڈر، کیمرے اور دیگر آلات سامنے آنے لگے۔ یوں دیگر امور کی رپورٹنگ کے ساتھ جنگی رپورٹنگ نے بھی ایک علیحدہ شعبہ کی حیثیت اختیار کر لی۔ بیسویں صدی کی آخری نصف صدی کے دوران جنگوں، علاقائی تنازعات اور خانہ جنگیوں کی براہ راست رپورٹنگ اور ٹیلے ویژن کوریج کا سلسلہ شروع ہوا جو آج تک جاری ہے۔

جنگ یا تنازعات کی کوریج کے مثبت اور منفی پہلو:

ذرائع ابلاغ اور اس سے وابستہ افراد بالخصوص رپورٹروں سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ کسی نزاعی صورتحال کی کوریج کرتے ہوئے کسی بھی قسم کے جانبدارانہ رویئے کا مظاہرہ نہیں کریں گے۔ وہ مذہبی، قومیتی، لسانی یا نسلی بنیادوں پر کسی ایک فریق کی حمایت یا دوسرے فریق کی مخالفت میں متعصبانہ رپورٹنگ سے گریز کریں گے۔ محاذ جنگ یا تنازع کی جگہ سے موصول ہونے والی رپورٹ کو ادارہ اور عوام صحیح تسلیم کرنے پر مجبور ہوتے ہیں، کیونکہ ان کے پاس حقائق تک پہنچنے کا کوئی اور راستہ نہیں ہوتا، اسلئے اگر یہ رپورٹ حقائق پر مبنی ہوگی تو تنازعات کے حل میں اہم کردار ادا کر سکے گی، بصورت دیگر اس مسئلہ کو مزید پیچیدہ بنانے کا سبب بن سکتی ہے۔

مثبت اثرات:

ذرائع ابلاغ اور ان سے وابستہ افراد نے جن مواقع پر اپنے قومی تشخص اور مذہبی وابستگی سے بلند ہو کر غیر جانبدارانہ رپورٹنگ کی ہے، اس سے عوام تک صحیح معلومات پہنچی ہیں اور تنازع

کے حل میں خاصی مدد ملی ہے۔ جس کی چند مثالیں درج ذیل ہیں:

☆ 1970ء کے عشرے میں امریکی ذرائع ابلاغ نے ویت نام کے حوالے سے جرأت مندانہ رپورٹنگ کی، جس کی وجہ سے امریکی رائے عامہ اس جنگ کے خلاف ہموار ہوئی اور امریکی حکومت ویت نام سے نکلنے پر مجبور ہوئی۔

☆ سابقہ یوگوسلاویہ کے علاوہ بوسنیا ہرزگووینا میں ہونے والی خانہ جنگی میں یورپی ذرائع ابلاغ کے مقابلے میں امریکی ذرائع ابلاغ نے اس تنازع کے تمام پہلوؤں کا غیر جانبدارانہ اور تعمیری انداز میں جائزہ پیش کیا، جس کی وجہ سے اس مسئلے کے حل میں مدد ملی اور مزید خون خرابے کو روکنے میں مدد ملی اور بوسنیا کی آزادی ممکن ہوسکی۔

☆ جنوبی افریقہ میں نسل پرستی اور امتیازی قوانین کی عالمی ذرائع ابلاغ نے جس حقیقت پسندانہ انداز میں منظر کشی کی، اس کے نتیجے میں عالمی رائے عامہ جنوبی افریقہ کے حق میں ہموار ہوئی اور نسل پرست حکومت کو آزادی دینا پڑی۔

☆ عراق جنگ میں امریکی حکومت کی غلط پالیسیوں اور گوانتاناموکیمپ اور ابوغریب جیل میں قیدیوں کے ساتھ ہونے والے انسانیت سوز برتاؤ کے بارے میں امریکی اور یورپی ذرائع ابلاغ نے جس پیشہ ورانہ دیانتداری اور جرأت مندی کا ثبوت دیا، اسکی وجہ پوری دنیا کو ان مظالم کے بارے میں آگہی ہوئی جو قیدیوں پر ڈھائے جارہے تھے۔ اس کا ایک اثر یہ ہوا کہ عالمی رائے عامہ عراق کے حق میں ہموار ہوئی اور امریکی عوام میں اس جنگ کی مخالفت بڑھی۔ جس کے نتیجے میں اس سال وسط مدتی انتخابات میں حکمران ری پبلکن پارٹی کو ایوان نمائندگان اور سینٹ میں شکست کا سامنا کرنا پڑا اور پھر 2008ء میں ری پبلکن پارٹی کو صدارتی انتخابات میں بھی شکست کا سامنا کرنا پڑا۔

☆ ایک برطانوی خاتون صحافی نے افغانستان کے دورے کے دوران بگرام جیل میں قید ایک خاتون قیدی کے کوائف جاری کئے جو بعد میں ڈاکٹر عافیہ صدیقی کے نام سے پہچانی گئی۔ اگر وہ خاتون صحافی قومی جذبہ سے سرشار یا مذہبی جذبات سے ملغوب ہو جاتی، تو پاکستانیوں کے فرشتوں کو بھی علم نہیں ہو پاتا کہ عافیہ صدیقی کون ہے اور کیوں قید ہے۔

منفی اثرات:

ذرائع ابلاغ یا اس سے وابستہ افراد اگر اپنے مذہبی، قومی یا لسانی جذبات سے ملغوب ہو کر جنگ یا تنازع میں ملوث ہو جائیں یا اس مسئلے کی نزاکت اور مستقبل میں اس کے ممکنہ اثرات کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی رپورٹنگ میں دانستہ یا نادانستہ ایسا مواد شامل کر دیں، جو جلتی پر تیل کا کام کرے، تو ایسی صورت میں تنازع حل ہونے کی بجائے مزید پیچیدہ ہو جاتا ہے، اور نقصانات میں اضافہ کے خطرات بڑھ جاتے ہیں۔ حالیہ تاریخ میں اسکی کئی مثالیں موجود ہیں:

☆ بوسنیا ہرزیگووینا میں ہونے والی خانہ جنگی کے دوران امریکی ذرائع ابلاغ کے مقابلے میں یورپی ذرائع ابلاغ کا رویہ خاصا جانبدارانہ تھا، جس کی وجہ سے یہ مسئلہ کئی برس تک الجھا رہا اور اس دوران ایک لاکھ 10 ہزار سے زائد لوگ لقمہ اجل بنے۔

☆ 2002ء میں بھارتی ریاست گجرات کے شہر گودھرا کے ریلوے اسٹیشن پر ٹرین کے چند ڈبوں میں آگ لگ گئی۔ ایک گجراتی چینل کے رپورٹر نے اس حادثہ کی رپورٹنگ کرتے ہوئے بعض ایسے غیر ذمہ دارانہ جملے کہے، جس کے نتیجے میں اس ریاست میں ہندو مسلم فسادات کی آگ بھڑک اٹھی اور ہولناک خون خرابے میں 20 ہزار کے قریب لوگ جاں بحق ہوئے اور اربوں روپے کی املاک کو نقصان پہنچا۔ رپورٹر نے رپورٹ دیتے ہوئے کہا تھا کہ اسٹیشن کے قریب مسلمانوں کی بستی ہے۔ انتظامیہ کو شک ہے کہ آگ لگانے والوں نے اس

بستی میں پناہ لی ہے۔ بعد میں ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کی تحقیقی رپورٹ میں حادثہ کا سبب بوگیوں میں شارٹ سرکٹنگ تھی۔ مگر ہزاروں افراد ناکردہ گناہوں کی بھینٹ چڑھ گئے۔

☆ جنگ یا کسی اہم عالمی یا علاقائی تنازع میں صحافی مذہبی، قومی یا نسلی تعصب کا شکار ہو کر ایسی رپورٹنگ کرتے ہیں، جس سے عوام کی نچلی سطحوں تک غیر منطقی اور متعصبانہ رویّہ سرائیت کر جانے سے نفرتوں میں مزید اضافہ ہوتا ہے، جو اس تنازع کے حل میں سب سے بڑی رکاوٹ بن جاتا ہے۔ آئرلینڈ کے مسئلے پر برطانوی صحافیوں نے پیشہ ورانہ ذمہ داریوں کا احساس کرنے کی بجائے پروٹسٹنٹ بن کر آئرش کیتھولک علیحدگی پسندوں کا معاخذہ کیا، جس نے فرقہ وارانہ تعصب کو مزید ہوا دی اور اس مسئلے کے حل میں الجھنیں پیدا ہوئیں۔

☆ گذشتہ صدی کے دوران مغربی ذرائع ابلاغ نے مسلم شدت پسندوں کے بارے میں دوہری پالیسی اختیار کی۔ یعنی 1980ء میں انہیں بطل حریت بنا کر پیش کیا اور سوویت یونین کے خلاف جنگ میں نہ صرف ان کی حمایت کی بلکہ ان کی منشیات کی اسمگلنگ سے بھی چشم پوشی کی۔ جبکہ 9/11 کے بعد انہی مجاہدین کو دہشت گرد قرار دے کر ان کی کردار کشی شروع کر دی۔ اس دوہری پالیسی کی وجہ سے افغانستان کا عالمی ریشہ دوانیوں کا مرکز بن کر ایک پیچیدہ مسئلہ کی شکل اختیار کر گیا۔ جس کا صائب حل مشکل ہو چکا ہے۔

☆ 9/11 کے بعد امریکی ذرائع ابلاغ نے پیدا ہونے والی نئی صورتحال کی جس انداز میں کوریج کی، اس کے نتیجے میں مغربی ممالک میں مسلمانوں کے خلاف نفرت اور ناپسندیدگی میں اضافہ ہوا اور دونوں کمیونٹیوں کے درمیان خلیج وسیع ہوئی۔

☆ روانڈا میں ذرائع ابلاغ خاص طور پر سرکاری ریڈیو نے جس

انداز میں سرکاری نقطہ نظر کی ترویج کی اس کے نتیجے میں وہاں نسلی ولسانی آویزش بدترین خانہ جنگی میں تبدیل ہوگئی، جس میں ہزاروں لوگ جان بحق ہوئے۔

☆ پاکستانی اور بھارتی میڈیا اپنی حکومتوں کے ایماء پر جس انداز میں کشمیر کے مسئلے کو پیش کرتے ہیں، اسکی وجہ سے اس مسئلے کے حل میں تاخیر ہورہی ہے۔

تنازعات اور جنگوں کی کوریج کرنے والے صحافیوں کی ذمہ داری:

ذرائع ابلاغ تنازع کے مختلف پہلوؤں کا غیر جانبدارانہ جائزہ لیتے ہوئے مختلف اور متبادل حل پیش کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اسلئے یہ متحارب گروپوں کے نقطہ نظر کو عوام کے سامنے پیش کرتے ہوئے، ان کے درمیان پیدا شدہ غلط فہمیوں کے ازالے میں نمایاں کردار ادا کرتا ہے، جس کے نتیجے میں اگر تنازع ختم نہیں ہوتا تو کم از کم اس کی شدت میں کمی کے امکانات ضرور پیدا ہوتے ہیں۔ اسی طرح محاذ جنگ کی کوریج گو کہ بہت خطرناک کام ہے، مگر یہ عوام کو جنگ کی ہولنا کیوں اور تباہ کاریوں کا صحیح منظر نامہ پیش کرکے انہیں فکری طور پر جنگ باز جذبات سے دور رہنے کیلئے تیار کرنے کا سبب بنتی ہے۔ اس سلسلے میں شعبہ ابلاغ عامہ کے ماہرین کا کہنا ہے کہ جنگ اور تنازعات کی کوریج کرنے والے صحافیوں کو درج ذیل باتوں کا خیال رکھنے کی ضرورت ہے۔

☆ ہمیشہ سچائی، پیشہ ورانہ دیانت داری اور غیر جانبداری کے ساتھ کوریج کریں اور اپنے جذبات اور احساسات پر قابو پانے کی کوشش کریں۔

☆ غیر مصدقہ خبروں، اعداد شمار اور افواہوں کو اپنی رپورٹ میں شامل کرنے سے گریز کرنا چاہئے۔

☆ یک طرفہ اور متنازع رائے پیش کرنے سے گریز کریں اور نہ ہی کسی قسم کی مبالغہ آرائی کا سہارا لیں۔

☆ زبان و بیان واضح اور شائستہ ہو، کیونکہ تلخ نوائی نیک نیتی کو

خاک میں ملا دیتی ہے۔

☆ ہر قیمت پر آزادیِ اظہار اور تنقید کے حق کا دفاع کریں، کیونکہ اس کے بغیر معاملات میں درستی ممکن نہیں ہوتی۔

☆ میدان جنگ سے رپورٹنگ کرتے ہوئے اپنی توجہ صرف احوال بیان کرنے تک محدود رکھیں۔

☆ کسی تنازع کی رپورٹنگ کرتے ہوئے متحارب گروہوں کے نقطہ نظر کے ساتھ ایک تیسرا معتدل نقطہ نظر بھی شامل کریں تاکہ لوگوں کو اندازہ ہو سکے کہ غیر متعلق لوگ اس تنازع کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔

☆ خانہ جنگی کی صورت میں بھی بہت محتاط انداز میں رپورٹنگ کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، کیونکہ خانہ جنگی میں عموماً ایک سے زائد متحارب گروہ شامل ہوتے ہیں اور اکثر یہ لڑائی انتہائی پیچیدہ شکل اختیار کر لیتی ہے۔

☆ متحارب گروہوں کے نمائندوں سے گفتگو یا بحث کے دوران صحافی کا رویّہ قطعی غیر جانبدارانہ ہونا چاہئے اور یہ تاثر پیدا نہیں ہونا چاہئے کہ وہ کسی ایک فریق کیلئے کسی قسم کا جذباتی لگاؤ یا ہمدردی رکھتا ہے۔

☆ رپورٹنگ کرتے وقت حقائق اور تبصرے کے فرق کو ملحوظ خاطر رکھنا چاہئے اور معلومات کے ذرائع کا احترام کرنا چاہئے۔

☆ چونکہ ذرائع ابلاغ کی جانب سے پیش کردہ خبروں اور جائزوں کے اثرات فوری اور دیرپا ہوتے ہیں، اسلئے عوام کی اکثریت ان سے امن کے ترجمان اور ثالث کے کردار کی توقع کرتے ہیں۔

☆ تنازعات کے حل میں باہمی مکالمہ اہم کردار ادا کرتا ہے اور ذرائع ابلاغ دلیل و مکالمہ کے فروغ کا ایک موثر فورم ہوتے ہیں، اسلئے ان کا ثالثی کردار زیادہ اثر انگیز اور فعال ہوتا ہے۔

☆ ناروے کے سینئر صحافی جان گک ٹنگ Johan Galtung سمیت دنیا بھر کے ذرائع ابلاغ کے ماہرین کی رائے میں جنگ اور تنازعات کی رپورٹنگ کرنے والے صحافیوں کو War Journalists کی بجائے صحافی برائے امن Journalist for Peace کہا جائے، کیونکہ ان کے خیال میں جنگ کی رپورٹنگ کا مقصد بھی فروغ امن ہوتا ہے۔

☆ حال ہی میں پاکستان اور بھارت کے اہم میڈیا ہاؤسز نے امن کی آشا جیسے پروگرم شروع کئے ہیں، جن کے اثرات بہر حال مرتب ہونا شروع ہو گئے ہیں۔

جنگوں اور تنازعات کی کوریج کرنے والے صحافیوں کو لاحق خطرات:

جہاں ذرائع ابلاغ طلاعات اور معلومات تک رسائی اور دلیل و مکالمہ کے ذریعہ تنازعات کے حل کا ایک اہم ذریعہ ہے، اس سے وابستہ افراد کی زندگیوں کو بھی شدید خطرات لاحق رہتے ہیں۔ میدان جنگ میں اکثر تھوری سی لاپرواہی یا ایڈونچر کی خواہش کے نتیجے میں صحافی اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ انیسویں صدی میں جبکہ جنگوں اور تنازعات کی براہ راست کوریج کا رواج کم تھا، 9 صحافی یورپ کے مختلف ممالک میں کوریج کے دوران جاں بحق ہوئے۔ بیسویں صدی میں دوسری عالمی جنگ کے علاوہ، کوریا، ویت نام، فلسطین، افریقہ میں ہونے والی جنگوں اور مختلف علاقائی مسلح تنازعات کی کوریج کے دوران مجموعی طور پر 74 صحافی اور فوٹو گرافر لقمہ اجل بنے۔ اکیسویں صدی کو شروع ہوئے ابھی صرف بارہ برس ہوئے ہیں، لیکن عراق اور افغانستان میں ہونے والی جنگ کے دوران جاں بحق ہونے والے صحافیوں کی تعداد 7 ہو چکی ہے۔ ان میں وہ صحافی شامل نہیں ہیں، جنہیں پاکستان کے قبائلی علاقے یا دنیا کے مختلف خطوں میں ہونے والے مسلح تصادم کے دوران قتل کیا گیا۔

مختلف مسلح عناصر اور متحارب گروہوں کی جانب سے صحافیوں کا اغواء اور ان پر جسمانی تشدد میں بھی اس صدی کے دوران خطرناک حد تک اضافہ ہوا ہے۔ امریکی صحافی ڈینیل پرل کا کراچی

میں اغوا کے بعد قتل اسی سلسلے کی ایک کڑی تھا۔ دنیا بھر میں صحافیوں کو صرف غیر ریاستی عناصر ہی سے خطرات لاحق نہیں ہیں، بلکہ ریاستی ادارے بھی انہیں اغواء کر کے قتل کر دیتے ہیں، جس کی مثال صحافی سلیم شہزاد کا اسلام آباد میں قتل ہے۔

جنگوں اور تنازعات کی کوریج کرنے والے صحافیوں کی ضروریات:

جنگوں اور مسلح تنازعات کی کوریج ایک ماہرانہ اور پرخطر کام ہے، اسلئے اس قسم کے واقعات کی کوریج اور رپورٹنگ کرنے والے صحافیوں کو درج ذیل امور کا خیال رکھنے کی ضرورت ہے۔

☆ ضروری شناختی دستاویز بالخصوص اپنے ادارے کا شناختی کارڈ اپنے ساتھ رکھیں اور جس ملک میں کوریج کیلئے گئے ہیں وہاں اپنے سفارت خانے کو اپنی آمد سے مطلع کریں اور دستاویزات کی ایک کاپی جمع کرائیں۔

☆ کوشش کریں کہ سٹیلائیٹ موبائل فون آپ کے ساتھ ہو، تاکہ کسی ناگہانی صورت میں رابطے کی آسانی ہو سکے۔

☆ جس علاقے میں جا رہے ہیں اس کا مکمل نقشہ اور نکلنے کے متبادل راستوں کو نشان زد کریں اور مقامی صحافیوں سے تعاون حاصل کریں۔

☆ جنگ کے دوران کسی بھی فریق کی ہمدردی حاصل کرنے یا اس سے کسی بھی سلسلے میں مدد حاصل کرنے سے گریز کریں۔

☆☆☆

جنگ اور سفارت کاری

ڈاکٹر مُطاہر احمد

یورپ میں 14 ویں صدی کے بعد صنعتی انقلاب برپا ہوا جس کے نتیجے میں معاشرتی اور ریاستی سطح پر انقلابی تبدیلیاں رُونما ہوئیں۔ جدید قومی ریاستوں کا تصور بھی انہی تبدیلیوں کے بعد وقوع پذیر ہوا۔ یہ جدید ریاستیں اپنے سیاسی اور معاشی مفادات کے تابع تھیں چنانچہ ریاستوں کے درمیان تعلقات کی بنیاد بھی سیاسی اور معاشی مفادات کے گرد گھومتی نظر آتی ہے۔ ریاستی مفادات ہر صورت میں اوّلین ترجیح قرار پاتے۔ حکمران طبقات اپنے مفادات کے حصول کے لئے کبھی جنگوں کے ذریعہ اور کبھی سفارت کاری کے ذریعہ پالیسیاں بنا کر اُسے ریاست کے مفاد سے جوڑ دیتے تھے اور اس کا نام ''قومی مفاد'' رکھ دیتے تھے۔ یہ سلسلہ آج بھی مختلف حوالوں اور حکمت عملی کے ذریعے قائم ودائم ہے۔

غرض جدید ریاستوں کی چھ سات سو سالہ تاریخ انہی پیراہوں کے گرد گھومتی نظر آتی ہے۔ جنگ اور سفارت کاری کی تعریف اگر کی جائے تو اس میں دو رائے نہیں ہیں کہ جنگیں ہمیشہ اپنے حریف کے وسائل پر قبضہ کرنے اور اُس کی معیشت اور سیاست کو تابع کرنے کی کوشش ہوتی ہے۔ چنانچہ تاریخ پر نظر ڈالیں تو یہ جنگیں کئی کئی سالوں پر محیط نظر آتی ہیں۔ جہاں تک سفارت کاری کا تعلق ہے تو اس کی تعریف کچھ اس طرح سے کی جاسکتی ہے کہ ریاست زیادہ سے زیادہ اپنے مفادات کو حاصل کرنے کی کوشش گفتگو کے ذریعے جسے ہم (Maximizing Ritust through talks) بھی کہتے ہیں۔

جدید بین الاقوامی تعلقات جس کا آغاز پہلی جنگ عظیم کے بعد سے ہوا اور آج تک جاری

ہے۔ جنگ اور سفارت کاری نئے نئے ڈھنگ اور نئی تشریحات کے ذریعہ بین الاقوامی سیاست پر اثر انداز ہو رہی ہے۔

اسی حوالے سے جب تنازعات کا ذکر آتا ہے تو خواہ وہ علاقائی تنازعات ہوں یا بین الاقوامی یہ تسلیم شدہ اُصول ہے کہ ریاست جب اپنے مفادات کو حاصل کرنے کے لئے سفارت کاری کا سہارا لیتی ہے اور اگر وہ اس عمل میں ناکام ہو جائے تو طاقت کے استعمال کو جائز سمجھتے ہوئے جنگ مسلط کر دیتی ہے۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ جنگ کسی ایک وجہ سے نہیں ہوتی۔ اس میں قیادت، قومی ریاست کے مفادات اور بین الاقوامی معاشرے کے مفادات قابلِ ذکر وجوہات کہلائے جا سکتے ہیں۔ جہاں تک قیادت کا معاملہ ہے ذاتی مفادات، قیادت کا مہم جوئی Adventurism قابلِ ذکر ہیں۔ اگر قومی ریاست کے مفاد کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو قومی ریاست اگر کسی ملک کی قیادت کو غیر جمہوری کہے اور بین الاقوامی برادری کے زمرے میں آئے گا۔ بین الاقوامی نظام کے حوالے سے اگر دیکھا جائے تو اگر کوئی ریاست بین الاقوامی توازن طاقت میں بگاڑ کا سبب بنے یا پھر اسلحہ کی دوڑ کی وجہ سے ہمسائے ممالک کو سلامتی کے خطرے لاحق ہوں یہ پھر مذکورہ ریاست کی حرکات کی وجہ سے علاقائی اور بین الاقوامی نظام میں بگاڑ میں پیدا ہو تو اپنی ریاست کے خلاف دیگر ریاستوں کا اتحاد مذکورہ ریاست پر جنگ مسلط کر دیتا ہے۔ اس حوالے سے نازی جرمنی کی مثال دی جا سکتی ہے جو بظاہر تو جمہوری تھا لیکن ہٹلر کے فاشزم کا شکار تھا نیز نازی جرمنی اسلحہ کی دوڑ میں بھی شامل تھا اور علاقائی اور بین الاقوامی نظاموں کے لئے بھی چیلنج بنتا جا رہا تھا۔ چنانچہ اتحادیوں نے نازی جرمنی کو طاقت کے ذریعے زیر کیا کیونکہ سفارت کاری ہر عراق مرحلہ پر ناکام ہو چکی تھی۔ حالیہ دور میں عرق کی مثال دی جا سکتی ہے جہاں صدام حسین کی حکومت عراقی عوام، علاقائی ریاستوں اور بین الاقوامی قوتوں کے لئے مسائل پیدا کر رہی تھی چنانچہ 2003ء میں قوت کے ذریعے حکومت کا خاتمہ کیا گیا اور بعد ازاں مسلط کردہ جمہوریت نافذ کر کے عراق کو علاقائی اور بین الاقوامی قوتوں کے لئے قابل قبول بنایا گیا۔

ان مثالوں سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ جنگوں اور ڈپلومیسی کا یہ عمل ساتھ ساتھ چلتا ہوا نظر آتا ہے۔ ریاستی حکمران طبقات اپنے مفادات کے حصول کے لئے کبھی جنگیں کرواتے رہے اور پھر ڈپلومیسی کے ذریعے ان کا حل بھی نکلواتے رہے۔ اس ضمن میں پہلی اور دوسری جنگ عظیم

قابلِ ذکر ہیں۔ پہلی جنگ عظیم میں حکمران اتحاد نے جرمنی کو شکست دی اور نا اتفاقی کے ذریعہ جرمنی پر معاہدہ ورسائی تھوپ دی۔ اتحادیوں کے نزدیک یقیناً یہ ڈپلومیسی تھی لیکن اس ڈپلومیسی کے نتیجہ میں جرمنی میں فاشزم کی بنیاد رکھی اور پھر اس فاشزم کو ختم کرنے کے لئے دوسری جنگ عظیم میں دو کروڑ انسانوں کی قربانی دی گئی۔

دوسری جنگ عظیم کے خاتمہ کے بعد بین الاقوامی سیاست نظریاتی طور پر بٹ گئی۔ دوسرے الفاظوں میں سویت یونین اور امریکہ نے دنیا کو دو نظریاتی کیمپوں میں تقسیم کر دیا۔ گو کہ یہ دونوں ممالک نے آپس میں براہِ راست جنگ تو نہیں کی لیکن اپنے اپنے حلیفوں کی مدد ضرور کرتے رہے۔ سرد جنگ کے اس دور میں بہت سے نئے عناصر شامل ہوئے جو اس سے پہلے نہیں دیکھے گئے تھے۔ اوّل، سائنس اور ٹیکنالوجی کا استعمال جس نے ترقی کی ہیئت کو یکسر تبدیل کر کے رکھ دیا۔ دوئم، دو طاقتوں کا عالمی سطح پر تسلط قائم کرنا خواہ وہ معیشت ہو سیاست ہو یا پھر سماجی معاملات ہوں۔ سوئم، اسلحہ کی دوڑ اور نیوکلیئر طاقتوں کی رسہ کشی جس نے دنیا کو ہر لحاظ سے غیر مستحکم اور غیر محفوظ کر دیا۔

چنانچہ ان تبدیلیوں کے بعد کے جس کا تجربہ ماضی میں نہیں تھا نئے افکار اور نئی سوچوں نے جنم لیا۔ ڈپلومیسی اور جنگوں نے بھی نئے ڈھنگ اور نئے اسلوب اپنا لئے۔ روایتی ڈپلومیسی جس کی بنیاد گفتگو کے عمل کو خفیہ رکھنا، اور حکمران طبقات میں سے سفارت کار چننا اور عوام سے اس پورے عمل کو خفیہ رکھنا تھا۔ جدید ڈپلومیسی اس کے برعکس زیادہ کھلے پن زیادہ عوامی اور عوامی نمائندگان کے گرد گھومتی نظر آتی ہے۔ اس ڈپلومیسی کا مقصد گفتگو کے عمل کو جاری رکھنا تا کہ بین الاقوامی اور علاقائی معاملات کا پُر امن تصفیہ ہو سکے۔ اس ضمن میں ریاستی کردار (State Actions) کہ جو روایتی ڈپلومیسی کی بنیاد ہیں وہ غیر ریاستی کردار (Non-State Actions) کی اہمیت کو بھی اُجاگر کیا گیا۔ اس ضمن میں ڈپلومیسی کی نئی شکل سامنے آئیں جیسے اعتماد سازی کا عمل (Confidence Building Means) بھی کہا جاتا ہے۔ اعتماد سازی کا یہ عمل جدید ڈپلومیسی کے ضمن میں آتا ہے تا کہ تنازعات کو حل کیا جا سکے (Conflict Mangement)۔

اعتماد سازی کا یہ عمل کئی ٹریک سے گزر رہا ہے۔ جسے کہ Track I، Track II، Track III کہا جاتا ہے۔

اعتماد سازی کا یہ عمل سب سے پہلے 1975ء میں یورپ میں شروع ہوا اور جس کی بنیاد مشرقی

اور مغربی یورپ کو قریب لانا تھا۔ یہ تجربہ کسی حد تک کامیاب رہا۔ اس ماڈل پر مشرق وسطیٰ کے مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کی گئی جو ہنوز جاری ہے۔ بعد ازاں مسرق بعید میں اس کا تجربہ خاصہ کامیاب رہا۔ جنوبی ایشیا میں بھی اعتماد سازی کا عمل جاری ہے جس کے خاصے مثبت نتائج آ رہے ہیں۔

سوویت یونین کے خاتمہ کے بعد بین الاقوامی سیاست ایک نئے دور میں داخل ہوئی جس کی بنیاد خالصتاً معیشت پر رکھی گئی۔ معیشت کی اس جنگ نے دنیا کو سیاسی اور معاشی طور پر تقسیم کر دیا ہے۔ سیاسی اعتماد سے امریکہ کو بالادستی حاصل ہے جب کہ معاشی طور پر کئی مراکز ہمیں نظر آتے ہیں جیسا کہ یورپین یونین، چین، جاپان وغیرہ۔

سرد جنگ کے خاتمہ کے بعد یہ بات دیکھنے میں آتی ہے کہ تنازعات کے لئے ڈپلومیسی اور جنگ دونوں کا سہارا لیا جاتا رہا ہے۔ جس کی مثال بوسنیا ہے جہاں جنگ کا سہارا لیا گیا اور سربیا کو مجبور کیا گیا کہ وہ ''ڈیٹن معاہدہ'' پر دستخط کرے۔

9/11/2001 کے واقعہ نے جہاں بین الاقوامی سیاست کو نہ صرف ایک نیا رخ فراہم کیا بلکہ جنگ اور ڈپلومیسی کے میدان میں ایک نیا چیلنج بن کر اُبھرا۔

دہشت گردی کے خلاف جنگ کا باقاعدہ اعلان اقوامِ متحدہ کی قراردادوں کے ذریعہ کیا گیا جس کی تشریح یہ کی گئی کہ غیر مسلح افراد کے خلاف منظم دہشت گردوں کے ٹولوں کا قلع قمع کرنا ضروری ہے۔ دوسرے الفاظوں میں دہشت گرد قوتوں کا خاتمہ لازمی ہے جو معصوم افراد کو دہشت گردی کا نشانہ بناتے ہوں۔

دہشت گردی کی یہ جنگ غیر ریاستی کرداروں کے خلاف جاری ہے کیونکہ یہ غیر ریاستی کردار قومی ریاست کے تصور کو نہیں مانتے۔ ان کے نزدیک قومی ریاستوں کا تصور خالصتاً مغربی ہے اور ان کے عقائد سے میل نہیں کھاتا چنانچہ قومی ریاستوں کا وجود انہیں نظریاتی اعتبار سے قابل قبول نہیں ہے۔

ان غیر ریاستی طاقتوں کا خاتمہ اقوامِ متحدہ اور دیگر مغربی طاقتوں کے نزدیک جائز ہے۔

اس ضمن میں امریکہ نے پہل کی اور پھر نیٹو ممالک نے اس کا ساتھ دیا۔ گو کہ نیٹو اتحاد کا بنیادی مقصد سرد جنگ کے دوران سوویت یونین کے خلاف اجتماعی اتحاد تھا، سوویت یونین کے خاتمے کے بعد نیٹو نے اپنے ہدف کا تعین تبدیل کرتے ہوئے اُن قوتوں کی طرف موڑ دیا جو یا تو

ریاستی دہشت گردی کو جائز قرار دیتی ہوں یا پھر وہ غیر ریاستی عناصر جو قومی ریاستوں کے تصور کی نفی کرتے ہوں۔ اس حوالے سے قومی مفاد کا تصور ہی تبدیل ہو گیا ہے۔ عراق میں طاقت کا استعمال ہو یا پھر افغانستان میں نیٹو کی کارروائی دونوں جگہوں پر طاقت کے استعمال کو اس حوالے سے جائز قرار دیا جا رہا ہے کہ یہ کارروائیاں قومی مفاد کے عین تابع ہیں۔ اس ضمن میں سرحدی دراندازی ہو یا ڈرون کے حملے سب ہی جائز قرار پاتے ہیں۔

اس حکمت عملی کو جائز قرار دینے کے لئے جنگ اور ڈپلومیسی کا سہارا لیا جاتا رہا ہے۔

اس پیچیدہ صورتِ حال کا سامنا طفیلی ریاستوں (Client States) کے لئے بہت بڑا چیلنج بنی ہوئی ہیں۔ یہ طفیلی ریاستیں جن کا سیاسی، معاشی اور انتظامی ڈھانچہ دوسرے کے طفیل چلتا رہا خاص طور پر سرد جنگ کے دور میں جب دو قطبی نظاموں میں سے طفیلی ریاستیں کسی ایک کا انتخاب کر لیتی تھیں اور پھر ان کے معاشی ادارے امداد کی بنیاد پر چلتے رہتے تھے۔ مزید برآں سیاسی قوتیں بھی اپنے سہارے یہیں پر تلاش کر لیتی تھیں۔ سرد جنگ کے خاتمہ اور بالخصوص 9/11 کے بعد اندرونی تضادات اور باہمی رشتوں اور تعلقات تضادات کا شکار ہیں۔ پاکستان اور امریکہ کے تعلقات اس کی کلاسیکل مثال ہیں۔ پاکستان جو سرد جنگ میں امریکہ کا حلیف رہا اب دہشت گردی کی اس جنگ کی پیچیدگیوں کا شکار نظر آتا ہے۔

دوسری جانب پبلک ڈپلومیسی نے بھی وقت گزارنے کے ساتھ ساتھ جڑیں پکڑ لی ہیں، رائے عامہ اور خاص طور پر معاشرتی قوتیں (Societial forces) جو ریاستی جبر اور مسلط کردہ جنگوں کے خلاف رائے عامہ ہموار کرنے کی جدوجہد میں برسرِ پیکار ہیں۔ اس تبدیل ہوتی ہوئی صورتِ حال نے طفیلی ریاستوں کے لئے بہت بڑا مسئلہ کھڑا کر دیا ہے۔ طفیلی ریاستوں کے حکمران طبقات کے پاس ان مسائل کو حل کرنے کے لئے واضع پالیسی نہیں چنانچہ ان کی نافذ کردہ پالیسیوں میں اندرونی، علاقائی اور بین الاقوامی سطح پر تضادات ہی تضادات نظر آتے ہیں اور اس ضمن میں ریاست اور معاشرے (State-Society relations) میں دوری اور کھچاؤ کی کیفیت نظر آتی ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان تعلقات میں تناؤ بڑھتا ہی جا رہا ہے۔

آج اگر بین الاقوامی صورت حال کا تجزیہ کیا جائے تو یہ بات عیاں نظر آتی ہے کہ ریاستوں کے درمیان تعلقات پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتے نظر آتے ہیں۔ بین الاقوامی نظام میں طاقت کے

مرکز کے گرد گھومتا نظر آتا ہے جہاں بالادست ریاستیں اپنے مفاد کے حصول کے لئے ایسی پالیسیاں مرتب کرتی ہیں جو ترقی پذیر ممالک کے لئے قابل قبول نہیں ہیں۔ چنانچہ خلیج پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتی جارہی ہے اور بین الاقوامی نظام انتشار کا شکار ہے جس کی عکاسی معاشی اور سیاسی سطح پر دیکھی جاسکتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پیچیدہ مسائل کا حل بھی پیچیدہ ہوتا ہے سادہ نہیں۔ بین الاقوامی نظام کا انتشار سفر کرتے ہوئے نیچے تک آ گیا ہے جس کا مشاہدہ ہر سطح پر بخوبی کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ ضرورت اس امر کی ہے کہ تبدیل ہوتی ہوئی اس صورت حال کا ادراک حاصل کیا جائے۔

جنگ اور ڈپلومیسی جس نے تاریخ کے ہر دور میں اہم کردار ادا کیا ہے اور آج بھی کر رہی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ تاریخ کے تناظر میں موجودہ صورتِ حال کا تجزیہ کرتے ہوئے بہتر حل کی طرف پیش رفت کرتے ہوئے موجودہ چیلنجز کا سامنا کیا جاسکے اور ایک ایسا مستقبل تشکیل دیا جاسکے جس میں عوام کی ترقی اور خوشحالی کو اوّلین ترجیح حاصل ہو۔

حوالہ جات

1- Mark Amistuty, *International Conflict and Cereperation*, Brown & Benchmark: Chicago 1995.

2- *International Relations Theory Today*, Ken Booth and Steve Smith, The Pennslyvania State University Press, Pansylvania, 1995.

3- Paul Viotti, Mark Kauppi, *International Relations, Theory* Viacam Company: US, 1999.

4- John M. Habson, *The State and International Relations*, Cambridge University Press, UK, 2000.

☆☆☆

پیشہ وراور کرائے کے فوجی

ڈاکٹر مبارک علی

تہذیب کے ابتدائی دور میں جب لوگ بستیوں میں آباد ہوئے، تو معاشرے میں دو تین اہم طبقات ابھرے، ان میں سے ایک جماعت مذہبی سربراہوں یا پجاریوں کی تھی کہ جن کا کام تھا کہ وہ لوگوں اور ان کی فصلوں کو فطری آفات سے بچانے کے لئے دیوی و دیوتاؤں کو خوش رکھیں۔ دوسرا طبقہ جنگ جوؤں کا تھا، جن کے ذمہ یہ کام تھا کہ وہ بستیوں کو حملہ آوروں سے محفوظ رکھیں۔ تیسرا طبقہ کسانوں اور کاریگروں کا تھا کہ جو پیداواری عمل میں حصہ لیتے تھے اور ان دو طبقوں کی پرورش کرتے تھے۔

ہندوستان میں یہ تقسیم ذات پات کی شکل اختیار کر گئی، اور برہمن، کشتری، ویش، شودر اور اچھوت ویش ذاتیں ابھریں کہ جن کے ذمہ پیشہ ورانہ کام تھے۔ ابتداء میں ذات پات میں سختی نہیں تھی اور ایک ذات فرد ایک ذات سے دوسری ذات میں جا سکتا تھا مگر بعد میں اس قدر سختی ہوئی کہ جو جس ذات میں پیدا ہوا، اس کے لئے ناممکن تھا کہ وہ اپنی ذات یا پیشہ بدل سکے۔

چونکہ تاریخ کے قدیم عہد، اور قرونِ وسطیٰ میں قوموں، برادریوں اور قبائل کے درمیان جنگیں ہوتی رہتی تھیں۔ یہ جنگیں زمین پر قبضہ کرنے، مال و دولت کو لوٹنے اور لوگوں کو غلام بنانے کے لئے ہوتی تھیں، اس لئے ہر قوم و قبیلہ میں جنگ جوؤں کی ضرورت ہوتی تھی، جو اپنی قوم اور قبیلہ کو تحفظ فراہم کریں اور ان کے لئے مزید ذرائع کے لئے جنگ کریں۔

یونان کی ریاست ایتھنز میں ویسے تو ہر شہری کے لئے لازمی طور پر فوجی خدمات ادا کرنی ہوتی تھیں، خاص طور سے اگر کوئی حملہ آور آئے تو دفاع کے لئے ہر بالغ مرد میدان جنگ میں جاتا تھا۔ سقراط جو ایک فلسفی تھا، اس نے بھی اپنے شہر کے دفاع مین جنگ لڑی تھی۔ اس کے علاوہ ایتھنز کے معاشرے میں جنگ جوؤں کا طبقہ تھا جو ہوپ لائٹ (Hoplite) کہلاتا تھا۔ یہ تربیت یافتہ اور پیشہ ور فوجی ہوا کرتے تھے، جو شہر کا دفاع بھی کرتے تھے اور توسیع ملک کے لئے دوسرے ملکوں پر حملے بھی کرتے تھے۔

ایتھنز کے مقابلہ میں اسپارٹا کی ریاست تھی کہ جہاں ہر بالغ مرد فوجی ہوا کرتا تھا۔ ان کے دستور کے مطابق 7 سال کے لڑکے کو ان کے گھر سے علیحدہ کر کے، اسے فوجی کیمپ میں رکھا جاتا تھا، جہاں وہ 30 سال کے عمر تک رہتا تھا۔

کیمپ میں سخت فوجی تربیت دی جاتی تھی، اس کی وجہ سے اسپارٹا کی فوج ناقابل شکست بن کر ابھری، اور جنگوں میں کامیابیاں حاصل کیں۔ لیکن ایک وقت وہ آیا کہ جب یہ سختی ان کے فوجیوں کے لئے شکست کا باعث ہوئی۔

جنگوں کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ اس میں استعمال ہونے والے ہتھیاروں میں جدتیں آتی چلی گئیں، تلوار، نیزہ، تیر کمان کے ساتھ ساتھ رتھ کا استعمال ہوا، اس میں دو فوجی سوار ہوتے تھے، ایک رتھ کو کنٹرول کرتا تھا، دوسرا تیر کمان سے دشمن پر حملہ کرتا تھا۔ جب ابتداء میں گھوڑے کا استعمال ہوا تو باگ کے بغیر اس کو کنٹرول کرنا مشکل تھا، جب گھوڑے کو لگام کے ذریعہ کنٹرول کیا جانے لگا تو اس سے سوار محفوظ ہو گیا، بعد میں زین نے اس کو اور زیادہ محفوظ کر دیا، خاص طور سے وہ زین جو پیچھے سے ابھری ہوئی تھی، اور سوار کو گرنے سے روکتی تھی۔ فوجیوں نے خود کو اور زیادہ محفوظ بنانے کے لئے ڈھال، اور زرہ بکتر کو استعمال کرنا شروع کر دیا۔ اب فوج پیدل اور گھڑ سواروں پر مشتمل ہوتی تھی۔ پیدل فوج میں عام فوجی ہوا کرتے تھے جو گھوڑے کو خریدنے اور اسے رکھنے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے، جب کہ امراء کا طبقہ زرہ بکتر اور گھوڑوں کا استعمال کرتا تھا۔

ہندوستان میں ہاتھیوں کو جنگ میں استعمال کیا جاتا تھا۔ مگر یہ خطرناک تھا کیونکہ کبھی کبھی یہ ہاتھی پلٹ کر اپنی فوج کو تتر بتر کر دیتے تھے۔

ہتھیاروں کی ایجاد کے نتیجہ میں جنگ مہلک سے مہلک ہوتی چلی گئی، اور جب بارود کا استعمال ہوا، تو توپ خانہ جنگ میں استعمال ہونے لگا، جو فوجوں میں بہت زیادہ تباہی لاتا تھا۔

ابتدائی زمانے میں فوجیوں کی کوئی یونیفارم نہیں ہوتی تھی۔ اس کے علم، جھنڈے اور علامتیں ہوتی تھیں جو یہ میدانِ جنگ میں لایا کرتے تھے۔ جنگ میں دونوں جانب سے دیوی و دیوتاؤں کی مدد شامل ہوتی تھی، اور اکثر یہ جنگیں قبیلوں اور قوموں کے دیوتاؤں کے درمیان ہوتی تھیں۔ مذہبی جذبات کو ابھارنا، اس لئے ضروری تھا کہ فوجی ایک خاص مقصد کے لئے جان دینے کو تیار رہیں۔

تاریخ میں سب سے پہلے پیشہ ور فوج رومی سلطنت میں تیار کی گئی۔ رومیوں نے فوج کو لیجن میں تقسیم کر رکھا تھا۔ ایک لیجن میں 5 ہزار پیدل فوجی ہوا کرتے تھے۔ جو لوگ فوج میں شامل ہوتے تھے ان کی سخت تربیت ہوتی تھی، اور ان پر لازمی تھا کہ فوجی قوانین اور ڈسپلن کی پابندی کریں۔

پیدل فوج کی سب سے زیادہ اہمیت تھی، کیونکہ یہ بہترین تربیت کے بعد جنگ جو بنتے تھے۔ اس لئے رومی شہنشاہ ان کے ساتھ اچھا سلوک کرتا تھا۔ ان تربیت یافتہ فوجیوں کے ساتھ رضا کار فوجی بھی ہوا کرتے تھے۔

میدانِ جنگ میں یہ اسلحہ سے لیس ہو کر جاتے تھے۔ چہرہ کو خود سے ڈھک لیتے تھے، اور جسم پر زرہ بکتر ہوتی تھی۔ ہتھیاروں کے علاوہ ایک فوجی تھیلے میں کھانے کا سامان اور پانی کی بوتل ہوا کرتی تھی۔ یہ خاص قسم کے جوتے پہنتا تھا جو انتہائی مضبوط ہوا کرتے تھے۔

عہد وسطیٰ میں، یورپ میں جنگ جوؤں کا ایک طبقہ ابھرا، جو نائٹس (Knights) کہلاتے تھے۔ ان کا تعلق امراء کے طبقہ سے ہوتا تھا، اور جنگ کرنا ان کا پیشہ تھا۔ یہ میدانِ جنگ میں گھوڑے

پر سوار، پوری طرح سے مسلح ہو کر جاتے تھے، چونکہ رومی سلطنت کے زوال کے بعد جگہ جگہ قلعہ تعمیر ہو گئے تھے جہاں فیوڈل لارڈ اور اس کے نائٹس رہا کرتے تھے، لہٰذا ان کے درمیان اکثر لڑائیاں ہوتی رہتی تھیں۔ ان جنگوں کی وجہ سے کسان پریشان رہتے تھے کیونکہ ان کی فصلیں لوٹ لی جاتی تھیں، چرچ بھی ان کی لوٹ مار سے محفوظ نہیں تھے، اس لئے ان جنگوں سے بچنے کے لئے چرچ کے عہدے داروں نے مذہب کو استعمال کیا۔ انہوں نے Peace and grace of God خدا کے نام پر امن اور جنگ بندی کی اپیل کی۔ اس مقصد کے لئے نائٹس کو چرچ میں بلایا اور ان سے اولیاء کے تبرکات پر حلف لیا کہ وہ جنگ سے پرہیز کریں گے اور امن سے رہیں گے۔ اگر انہیں جنگ پر مجبور ہونا پڑے تو وہ عورتوں، بچوں، یتیموں، کسانوں، اور ان کے جانوروں کو قتل نہیں کریں گے۔ کرسمس، ایسٹر، اور دوسرے مذہبی تہواروں پر جنگ نہیں کریں گے، وغیرہ وغیرہ، اگر چہ اس پر عمل کم ہی ہوا، مگر یہ ایک قدم ضرور تھا کہ نائٹس کو لوٹ مار سے روکا جا سکے۔

یورپ کے ان نائٹس نے اپنے قواعد اور ضوابط بھی بنائے تھے جو Law of Chivlry کہلاتے تھے۔ ان قواعد کے ذریعہ ایک نائٹس کے لئے یہ لازمی تھا کہ وہ اپنے وعدہ کا پاس کرے۔ عورتوں اور کمزور لوگوں کی حفاظت کرے، کسی خاتون سے محبت کرے، جنگ میں بہادری سے لڑے۔

جب جنگ نہیں ہوتی تھی تو یہ نائٹس مقابلوں کے لئے ٹورنامنٹ منعقد کرتے تھے۔ ابتداء میں ان مقابلوں میں اصلی ہتھیار استعمال ہوتے تھے، جس کی وجہ سے لوگ قتل بھی ہوتے تھے۔ بعد میں کند ہتھیاروں کا استعمال ہونے لگا۔

صلیبی جنگوں کے دوران نائٹس نے ان جنگوں میں حصہ لیا۔ اس دوران دو ہاسپٹلرز (Hospitalars) اور ٹمپلرز (Templars) کے گروپس ابھرے، جنہوں نے مذہبی جوش و خروش سے ان جنگوں میں حصہ لیا۔

ہندوستان میں کشتریوں کا طبقہ اچانک غائب ہو گیا، اور ان کی جگہ راجپوتوں نے لے لی،

جن کے لئے جنگ ایک مقدس پیشہ تھی۔ انہوں نے بھی اپنے لئے قواعد وضوابط بنائے تھے۔ جس میں میدانِ جنگ سے فرار قابل شرم تھا، میدان جنگ میں مارا جانا قابلِ فخر۔

جوہر کی رسم میں، جب وہ یہ دیکھتے کہ ان کو شکست ہونے والی ہے تو وہ اپنے بچوں اور عورتوں کو قتل کر کے، زعفرانی لباس پہن کر میدان جنگ میں آتے اور ایک ایک کر کے اپنی جان دیدیتے تھے۔ اکبر نے جب چتوڑ کے محاصرے میں ان کی اس رسم کو دیکھا تو وہ راجپوتوں سے سخت متاثر ہوا، اور ان کی بہادری کی تعریف کی۔ ٹاڈ (Tod) نے Annals of Rajasthan میں ان کی تاریخ کو زبانی اور کہانیوں کی مدد سے لکھا ہے۔

پہلی عوامی فوج کی ابتداء یورپ میں فرانس کے انقلاب 1789 میں ہوئی جب یورپ کی دوسری طاقتوں نے فرانس پر حملہ کیا تو پہلی مرتبہ لوگوں کو معمولی تربیت دے کر ان کو فوجی ترتیب دی گئی جو انقلاب کے جذبے سے معمور تھی۔ انہوں نے مارسلز (Marseilles) کا قومی ترانہ گاتے ہوئے مارچ کیا اور انقلاب کا دفاع کیا۔

یورپ میں مستقل پیشہ ور فوج (Standing Army) کا قیام پندرہویں صدی عیسوی میں عمل میں آیا کہ جب حکمرانوں نے مستقل فوج کو ملازم رکھنا شروع کر دیا۔ اس سے اس کی طاقت میں اضافہ ہوا، اور وہ فوج کے لئے فیوڈل لارڈز کا محتاج نہیں رہا۔ اس وجہ سے 1688 میں جب انگلستان میں ''شاندار انقلاب'' (Glorius Resolution) آیا تو پارلیمنٹ نے خاص طور سے پیشہ ور مستقل فوج کی مخالفت کی تا کہ بادشاہ مطلق العنان نہ ہو، اور پارلیمنٹ سے مقابلہ نہ کر سکے۔

حکمرانوں اور امراء کی فوجوں میں اکثریت کسانوں کی ہوتی تھی، جو کسی جنگ یا مہم کے موقع پر فوجی خدمات ادا کرتے تھے، جب جنگ ختم ہو جاتی تھی تو یہ واپس کھیتی باڑی میں معروف ہو جاتے تھے۔ جو فوجی مستقل ملازم ہوتے تھے، ان کی فوجی تربیت ہوتی تھی۔ وقتی طور پر فوج میں شامل ہونے والوں کو معمولی تربیت کے بعد میدان جنگ میں بھیج دیا جاتا تھا۔ میدان جنگ

میں مرنے والوں کے خاندان کو کسی قسم کا معاوضہ نہیں دیا جاتا تھا۔ نہ زخمیوں اور معذوروں کی مدد کے لئے کوئی انتظام تھا۔ اکثر ان کی تنخواہیں بھی واجب الادا رہتی تھیں۔

کرایہ کے فوجی

یہ دستور تھا کہ جنگ کے موقع پر زیادہ سے زیادہ لوگوں کو ملازم رکھا جاتا تھا جب جنگ ختم ہوتی تھی تو ان لوگوں کو ملازمت سے فارغ کر دیا جاتا تھا۔ لہٰذا کسان تو واپس گاؤں چلے جاتے تھے مگر شہری اور امراء کے طبقہ سے تعلق رکھنے والے بیکار ہو جاتے تھے۔ لہٰذا یہ لوگ اپنے گروہ بنا کر کرایہ کے فوجی بن جاتے تھے اور جس کو بھی ضرورت ہوتی تھی، معاوضہ کے عوض میں اس کے لئے جنگ کرتے تھے جب قدیم یونان میں، 4 صدی عیسوی میں یونانی اور ایرانیوں کے درمیان جنگوں کا خاتمہ ہوا تو یونانیوں کی بڑی تعداد بیکار ہو گئی، ان میں سے اکثر کرائے کے فوجی بن گئے۔

ایران کی خانہ جنگی میں سائرس دی ینگر (Cyras The Younger) نے ابھی اپنے بھائی، جو ایران کا بادشاہ تھا اس کے خلاف دس ہزار فوجیوں کی خدمات حاصل کیں۔ یونان کے مورخ زینوفان (Zanofan) نے جو اس مہم میں ان کے ساتھ تھا، اس کی پوری تفصیل لکھی ہے۔ زینوفان کے مطابق جب میسوپوٹامیہ یا عراق میں یہ جنگ ہوئی تو دس ہزار یونانی اس بہادری سے لڑے کہ ایران کے بادشاہ کو شکست ہونے والی تھی، مگر اتفاق سے سائرس ایک نیزہ کا شکار ہو کر میدانِ جنگ میں مارا گیا۔ اس کے مرتے ہی اس کی فوج تتر بتر ہو گئی اور یہ دس ہزار کرایہ کے فوجی بھی اپنے سرپرست سے محروم ہو گئے۔ لہٰذا انہوں نے موقع کی نزاکت دیکھتے ہوئے، ایرانی بادشاہ سے صلح کی درخواست کی۔ اس پر اس نے اس کے دو سرداروں کو بلایا، اور دھوکے سے انہیں قتل کر دیا، بقایا یونانی فوجیوں نے زینوفان کو اپنا سردار بنایا اور واپس یونان کا سفر شروع کیا، 33 سو میل کا فاصلہ طے کر کے بالآخر چھ ہزار فوجی واپس ہوئے۔

یورپ میں سوئس (Swiss) فوجی بطور کرایہ کے مشہور تھے۔ یورپ کے حکمراں جنگوں میں

ان کی خدمات لیا کرتے تھے۔ پوپ کے محافظ کے طور پر سوئس(Swiss) گارڈز کو بھرتی کرنے کا رواج ہوا، آج بھی یہ اس کے محافظ کے طور پر ملازم ہوتے ہیں۔

ہندوستان میں 18 ویں اور 19 ویں صدی میں کرایہ کے فوجیوں کی مانگ بڑھ گئی تھی۔ اس کی وجہ مغل سلطنت کا زوال تھا۔ جس کی وجہ سے کافی تعداد میں فوجی بیروزگار ہو گئے تھے۔ امن وامان کی بگڑتی صورت حال میں چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے حکمراں اس قابل نہیں تھے کہ وہ گاؤں والوں سے لگان وصول کر سکیں۔ اس صورت میں فوجی مہم جوؤں نے اپنے اپنے فوجی جتھے بنا رکھے تھے اور ریاستوں کے والیان لگان کی وصولی کے لئے انہیں کرایہ پر لیتے تھے۔ جب انہیں یہ کام نہیں ملتا تھا تو یہ پھر شہروں کو لوٹ کر اپنا گزارا کرتے تھے۔

اس دوران یورپ سے کافی تعداد کرائے کے فوجیوں کی ہندوستان میں آمد ہوئی خاص طور سے نپولین کی شکست کے بعد فرانسیسی فوجی جو اس کی فوج میں تھے وہ ملازمت کی تلاش میں ہندوستان آئے۔ ان میں سے اکثریت نے مرہٹوں اور سکھوں کی ریاست میں ملازمت حاصل کی۔ بعض نے اپنے فوجی گروہ بنائے اور جس کو ضرورت ہوتی اس کے لئے جنگ کی۔ ان ہی میں ایک تھامس جارج تھا، جس نے ہریانہ میں جارج گڑھ کے نام سے قلعہ بنایا تھا اور وہاں رہا کرتا تھا۔ یہ یورپی کرایہ کے فوجی ہندوستان میں مال و دولت کی تلاش میں آئے تھے، جو انہیں ان کے تصور سے زیادہ ملی۔ کچھ نے تو یہیں شادی بیاہ کئے اور مستقل طور پر آباد ہو گئے۔ کچھ نے مال و دولت اکٹھی کی اور واپس جا کر عیش و آرام کی زندگی گذاری۔

اس صورتِ حال میں ہندوستانی بھی بطور کرایہ کے فوجی بڑی تعداد میں دستیاب تھے کیونکہ سیاسی ابتری کی وجہ سے ملازمتوں کا فقدان تھا، لہٰذا لوگ اپنا گھوڑا اور اسلحہ لے کر فوجی ملازمت کی تلاش میں رہتے تھے۔ اکثر یہ صورت حال ہو جاتی تھی کہ باپ و بیٹا دونوں جنگ میں ایک دوسرے کے سامنے ہو جاتے تھے۔ ان کرایہ کے فوجیوں کے لئے مذہب، قوم اور قبیلہ و برادری کی شناخت ختم ہو جاتی تھی، وہ اپنے سرپرست کے مفاد کے تحت جنگ کرتے تھے۔ جنگ کے بعد ان

کا معاہدہ ختم ہو جاتا تھا اور یہ پھر مارکیٹ میں کسی اور جنگ میں بطور کرایہ کے سپاہی لڑنے کے لئے تیار ہو جاتے تھے۔

کرایہ کے یہ فوجی موجودہ زمانے میں بھی موجود ہیں، افریقہ کے ممالک کی جنگوں میں یورپ سے یہ کرایہ کے فوجی بطور معاوضہ ان جنگوں میں حصہ لیتے رہے ہیں۔

کرایہ کے فوجیوں کے لئے جنگ ایک پیشہ ہوا کرتی ہے۔ انہیں اس سے کوئی غرض نہیں ہوتی ہے کہ کون صحیح ہے اور کون غلط۔ یہ ان اخلاقی پابندیوں سے آزاد اپنے معاوضہ کی خاطر لڑتے ہیں۔

مالِ غنیمت

جنگ میں جہاں مذہبی، قومی، نظریاتی، جذبات ہوتے ہیں، وہاں مالِ غنیمت کا حصول بھی فوجیوں کے لئے جنگ میں شرکت کرنا اور فتح کی صورت میں مالِ غنیمت حاصل کرنا، جنگ میں شرکت کا اہم جذبہ ہوا کرتا تھا۔

روایتاً یہ تسلیم کر لیا گیا تھا کہ فاتح کو شکست خوردہ مخالف کے مال و دولت پر قبضہ کرنا جائز ہے۔ اس لئے اس میں فاتح کو کسی قسم کے اخلاقی بحران کا سامنا نہیں کرنا پڑتا تھا۔

مالِ غنیمت میں ابتدائی دور میں شکست خوردہ لوگوں کو غلام بنانا تھا، ان کی عورتوں کو کنیز۔ اس لئے جو قومیں جنگ میں فاتح ہوتی تھیں ان کے ہاں غلام مردوں اور کنیز عورتوں کی بڑی تعداد جمع ہو جاتی تھی۔

رومیوں نے چونکہ ایک بڑی ایمپائر کی بنیاد ڈالی تھی اور یہ مسلسل دوسری قوموں سے جنگ کرتے تھے اس لئے ان کے ہاں غلاموں کی بڑی تعداد جمع ہو گئی تھی، یہاں تک کہ یہ ان سے خوف زدہ بھی رہنے لگے تھے۔ یہ غلام ایک طرف تو گھریلو کام کرتے تھے تو دوسری طرف کھیتی باڑی اور کان کنی میں بھی ان سے کام لیا جاتا تھا، اس وجہ سے کچھ مورخوں کا خیال ہے کہ رومی سلطنت کے

زوال میں ان غلاموں کا حصہ شامل ہے، چونکہ ان کی وجہ سے رومیوں نے خود سے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ جب غلام کھیتی باڑی میں مصروف ہوئے تو رومی کسانوں کی بڑی تعداد بے روزگار ہوگئی اور یہ لوگ ہر ہنگامہ میں شریک ہونے لگے۔

مالِ غنیمت کا دوسرا استعمال یہ ہوا کہ حکمرانوں نے بڑے بڑے محلات مندر اور مقبرے تعمیر کرائے۔ مثلاً قدیم مصر کے فراعین نے جو مالِ غنیمت حاصل کیا اسے اہرام مصر کی تعمیرات میں صرف کیا اور سونے و چاندی و ہیرے جواہرات کو اپنے ساتھ دفن کیا۔

رومیوں کے پاس جب مالِ غنیمت بڑی تعداد میں آیا تو انہوں نے شہر روم میں شاندار عمارتیں تعمیر کرائیں۔ اس کی مثالیں ہم دوسری بڑی سلطنتوں میں بھی دیکھتے ہیں۔ مگر جب یہ سلطنتیں زوال پذیر ہوئیں، اور مالِ غنیمت کی آمد نہیں رہی، تو ان کی تعمیر شدہ عمارتیں خستہ و شکستہ ہو گئیں اور سیاسی محلوں کے ساتھ ہی یہ بھی زوال کی علامت بن گئیں۔

اس لئے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا مالِ غنیمت سے فاتح قوموں نے ترقی کی، یا اس کا استعمال شاندار عمارتوں اور عیاشیوں میں ہوا، جو ان کے زوال کو نہ روک سکا۔ آج نہ وہ روم کی سلطنت ہے، نہ عربوں کی شان و شوکت، نہ پرتگال، اسپین، انگلستان اور فرانس کی برتری۔

لہٰذا جنگ کے موضوع پر بحث کرتے ہوئے، یہ سوچنا ضروری ہے کہ کیا جنگوں نے قوموں کو فائدہ پہنچایا ہے یا نقصان؟ اور کیا یہ جنگیں وقت کے ساتھ ختم ہوں گی؟ یا انہیں کے ذریعہ قومیں اپنے مسائل کے لئے استعمال کرتی رہیں گی؟

☆☆☆

صدارتی اظہارِ خیال

جنگ اور تاریخ ___ چند زاویے

ڈاکٹر سیّد جعفر احمد

سب سے پہلے تو میں شہید ذوالفقار علی بھٹو انسٹی ٹیوٹ آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی (SZABIST) اور آج کی کانفرنس کے روحِ رواں، مدیرِ 'تاریخ' ڈاکٹر مبارک علی صاحب کا مشکور ہوں کہ آج کی کانفرنس کے اس دوسرے اجلاس کی صدارت کے لیے آپ نے مجھ جیسے طالب علم کو منتخب کیا۔ میں آج صبح کے اجلاس میں بھی حاضر تھا اور اُس اجلاس میں جو فکر انگیز مقالے پیش کیے گئے میں نے ان سے حتی المقدور روشنی بھی حاصل کی۔ موجودہ اجلاس میں چار مقالے پیش کیے گئے ہیں۔ میری کوشش ہوگی کہ میں ان چاروں کے بارے میں اختصار کے ساتھ اپنا تبصرہ پیش کروں۔ بعد میں، میں چند ایک سوالوں کے جواب دینے کی کوشش بھی کروں گا جو ان مقالوں کے حوالے سے ابھی سامعین کی طرف سے کیے گئے ہیں۔ اپنی گفتگو کے آخر میں، میں یہ کوشش بھی کروں گا کہ آج صبح کے اور موجودہ اجلاس میں پڑھے جانے والے مقالات کی سماعت کے دوران ذہن میں آنے والے بعض ایسے نکات جو آئندہ تحقیق کا موضوع بن سکتے ہیں ان کی بھی نشاندہی کروں۔ ان نکات کو ہم مستقبل کے تحقیقی یا ریسرچ ایجنڈے کے طور پر زیرِ غور لا سکیں تو شاید یہ آج کی کانفرنس کو مزید سودمند بنانے کا ایک ذریعہ ثابت ہو۔

اس اجلاس میں جو پہلا مقالہ پیش کیا گیا وہ اشفاق سلیم مرزا صاحب کا تھا جو اسلام آباد میں رہتے ہیں اور اس کانفرنس میں ان کی شرکت ویڈیو کانفرنسنگ کے ذریعے ہوئی۔ بدقسمتی سے ویڈیو کانفرنسنگ کے آلات مسلسل گڑبڑ کرتے رہے جس کی وجہ سے نہ تو مرزا صاحب کی تصویر کو آپ لوگ دیکھ سکے اور نہ ہی ان کی گفتگو واضح طور پر سنائی دے سکی۔ اس کے باوجود جتنا کچھ ہم سن اور سمجھ سکے اس سے ان کی گفتگو کا ایک خاکہ ذہن میں ضرور بن سکتا ہے۔ یہاں بہت سے طالب علم بیٹھے ہیں، لہٰذا ان کی اطلاع کے لیے میں یہ بتانا چاہوں گا کہ اشفاق سلیم مرزا صاحب ہمارے اہم دانشور ہیں جو ماضی میں صحافت کے علاوہ سیاسی ایکٹوزم میں بھی مشغول رہے۔ ان کو فلسفے اور فلسفۂ تاریخ سے خصوصی رغبت ہے اور ان موضوعات پر انہوں نے کئی کتابیں اور مقالے لکھے ہیں۔ آج بھی ان کی گفتگو کو جنگ اور تاریخ کے تعلق کو فلسفیانہ سطح پر سمجھنے کی ایک کوشش سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے 'مہابھارت' کی کہانی اور پھر ایسی ہی قدیم اساطیری داستانوں سے بات شروع کر کے عہدِ وسطیٰ میں یورپ کی جنگوں اور دورِ حاضر میں یورپ سمیت مختلف ملکوں کی جنگوں کا تذکرہ کیا۔ ان کے بیانیہ میں ہیگل اور مارکس کا کئی مرتبہ حوالہ آیا اور یہ بات واضح ہوئی کہ وہ جنگوں کو ایک لحاظ سے جدلیاتی عمل کے حصے کے طور پر دیکھ رہے ہیں۔ مرزا صاحب کا تفصیلی مؤقف تو ان کا مقالہ شائع ہونے کے بعد ہی سامنے آئے گا لیکن یہاں میں صرف یہ گزارش کرنا چاہوں گا کہ جنگوں کے اسباب میں سرِفہرست معاشی عوامل ہوتے ہیں۔ دونوں عالمی جنگیں، خاص طور سے دوسری عالمی جنگ سرمایہ دارانہ نظام کے داخلی تضادات اور اس کے ایک شدید بحران ہی کا شاخسانہ تھی۔

لیکن تاریخ کی بیشتر جنگیں ایک ہی طبقے کے لوگوں کے درمیان ہوئی ہیں۔ جب ایک بادشاہ دوسرے بادشاہ سے یا ایک ملوکیت دوسری ملوکیت سے یا ہمارے زمانے تک پہنچتے پہنچتے ایک قومی ریاست دوسری قومی ریاست سے معرکہ آراء ہوئی تو اس کے پیچھے بنیادی محرک اقتصادی منفعت کا حصول ہی تھا لیکن ملک گیری کی ان ساری جنگی مہموں میں فاتح اور مفتوح دونوں ہی اپنی اپنی

مملکت کے مقتدر اور حکمران طبقات ہوتے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کی فوجوں میں شامل سپاہی اور جانوں کی قربانی دینے والے زیادہ تر نچلے طبقات کے لوگ تھے۔ لہٰذا ساری ہی جنگوں کو بہت آسانی کے ساتھ جدلیاتی اصولوں کا مظہر قرار نہیں دیا جاسکتا۔ جدلیات کا اصل تصور طبقاتی کشمکش کا تصور ہے۔ جدلیات اور جدلیات کا یہ عمل دو ملکوں کے بجائے بنیادی طور پر دو طبقوں کی لڑائی کا مظہر ہوتا ہے۔ اس کی سادہ سی تشریح یہ ہے کہ ہر پیداواری نظام کو دو حوالوں سے پہچانا جاسکتا ہے۔ ایک تو اس نظام کی پیداواری قوتیں ہوتی ہیں جن میں آلاتِ پیداوار، پیداوار کے لیے مطلوب خام مال اور پیداوار پر مائل محنت فراہم کرنے والے انسان ہوتے ہیں۔ ان پیداواری قوتوں کے علاوہ ہر نظام کے اندر چند مخصوص پیداواری رشتے بھی ہوتے ہیں۔ یہ رشتے اس بات سے متعین ہوتے ہیں کہ آلات و ذرائع پیداوار کی ملکیت کس کے پاس ہے اور ان آلات و ذرائع کو اپنی محنت سے پیداوار کی شکل میں ڈھالنے والے لوگ کون ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ہر پیداواری نظام میں ایک طرف ذرائع پیداوار کے مالک اور دوسری طرف اپنی محنت کے ذریعے پیداواری عمل کو آگے بڑھانے والے محنت کش کی تقسیم موجود ہوتی ہے۔ ان ہی دونوں کے درمیان طبقاتی کشمکش بھی جاری وساری ہوتی ہے۔ اب اس ساری صورتِ حال کو اور اس سارے نظام کو دو ملکوں کے درمیان جنگوں پر آسانی کے ساتھ منطبق نہیں کیا جاسکتا۔

یہاں ایک اور امر کی وضاحت بھی ضروری ہے۔ بعض اوقات یہ سوال کیا جاتا ہے کہ طبقاتی کشمکش بھی تو تشدد اور عسکریت کے دائرے میں داخل ہوسکتی ہے اور اگر ایسا ہے تو پھر جنگ سے یا مسلح کشمکش سے کس طرح بچا جاسکتا ہے۔ امن کی تحریک سے وابستہ ہم جیسے کارکنوں سے اکثر یہ سوال کیا جاتا ہے کہ تضادات اور تصادم اگر جدلیات کا ناگزیر حصہ ہیں تو پھر طبقاتی کشمکش اور طبقاتی جدوجہد پر یقین رکھنے والے تشدد اور مسلح جدوجہد سے انکار کیونکر کرسکتے ہیں۔

اس ضمن میں میری گزارش یہ ہے کہ طبقاتی کشمکش پر یقین رکھنے کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ ہم ہر مسئلے کا حل مسلح طور پر یا تشدد کے ذریعے نکالنے کی بات کریں۔ کارل مارکس، جنہوں نے

جدلیات کے تصور کو بڑے سائنسی انداز میں بیان کیا، وہ تشدد کے علمبردار ہرگز نہیں تھے۔ مارکسزم انسانی زندگی میں ان تمام چیزوں کی حمایت و وکالت کرتا ہے جو زندگی میں حسن وخوبی پیدا کرنے والی ہیں۔ وہ ادب اور شاعری، آرٹ وتھیٹر، غرض جملہ علوم وفنون کا جویا ہے اور ثقافت کی نشوونما اس کی توجہ کا ایک اہم موضوع ہے۔ مارکسزم کی رُو سے طبقاتی جدوجہد کے لیے بھی ثقافت کے دائرے کو منتخب کرنا اور تخلیقی عمل کے ذریعے اس جدوجہد کو آگے بڑھانا بہت ضروری ہے۔ تشدد صرف اس وقت ناگزیر ہوتا ہے جب وہ ظالم کی متشدد کارروائی کی مزاحمت کے حصے کے طور پر اختیار کرنا پڑے۔ ہم سب یہ سمجھ سکتے ہیں کہ تشدد میں پہل کرنے اور مزاحمت کے درمیان زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ کسی بھی سماج کے پسے ہوئے طبقات اپنی جدوجہد کے دوران مزاحمت تو کرتے ہیں لیکن تشدد میں پہل نہیں کرتے۔ چنانچہ امن کی جدوجہد اور طبقاتی کشمکش دونوں چیزوں کے درمیان کوئی بنیادی تضاد نہیں ہے۔

اس اجلاس میں دوسرا مقالہ جو جامی چانڈیو صاحب نے پیش کیا وہ سندھ کی بمبئی سے علیحدگی کے موضوع پر تھا۔ چانڈیو صاحب بڑے باخبر سیاسی مبصر اور روشن خیال دانشور ہیں۔ صوبائی خودمختاری اور خاص طور سے اس کے مالیاتی پہلوؤں پر ان کی گہری نظر ہے۔ چنانچہ سندھ کی بمبئی سے علیحدگی پر بھی ان کا مطالعہ اور نتائج فکر قابلِ قدر ہیں، لیکن بظاہر سندھ سے بمبئی کی علیحدگی کا موضوع آج کی کانفرنس کے موضوع یعنی جنگ اور تاریخ سے ذرا ہٹا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ لیکن اپنی گفتگو کے آخر میں انہوں نے جو یہ بات کہی کہ 'بمبئی سے سندھ کی علیحدگی کیونکہ ایک پُرامن جدوجہد کا نتیجہ تھی لہٰذا اس سے ہم یہ سبق حاصل کر سکتے ہیں کہ کوئی بھی سیاسی ہدف حاصل کرنا ہو تو اس کو پُرامن ذرائع سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ ان کا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ غیر متشدد اور پُرامن ذرائع ہی دیرپا سیاسی مقاصد کے حصول کا زیادہ قابلِ اعتبار ذریعہ ثابت ہوتے ہیں۔ سیاسی جدوجہد اگر تشدد کا راستہ اختیار کرے تو اس کے بہت سے منفی اثرات نکل سکتے ہیں جو مستقبل کو داغدار کرتے رہتے ہیں۔

یہاں میں یہ گزارش کروں گا کہ مقالہ نگار اگر سندھ کی بمبئی میں شمولیت اور پھر بمبئی سے علیحدگی کے موضوع کو استعمار کی مجموعی سیاسی حکمتِ عملی اور برطانوی استعماری نظام کی جنگی معیشت کے تصور کے تناظر میں ازسرِنو دیکھنے کی کوشش کریں تو شاید اس سے مطالعے میں مزید گہرائی اور معنویت پیدا ہو جائے گی اور یہ ان کے اس مطالعے کو آج کی کانفرنس کے موضوع سے اور زیادہ قریب لے آئے گی۔

اس اجلاس میں تیسرا مقالہ مقتدا منصور صاحب نے پیش کیا۔ ان کے مقالے کا عنوان 'جنگ اور ذرائع ابلاغ تھا' جس میں انہوں نے یہ دکھانے کی کامیاب کوشش کی کہ ذرائع ابلاغ جنگ کی حمایت میں اور جنگی جنون پھیلانے میں کتنا بڑا کردار ادا کرتے ہیں۔ ان کے خیالات کی تائید کرتے ہوئے میں یہ مزید عرض کرنا چاہوں گا کہ ماضی میں جہاں ذرائع ابلاغ نے جنگوں کو فتوحات، شہادتوں، جھنڈوں کے لہرائے جانے، غرض عزم و عزیمت کے حوالے سے دنیا کے سامنے پیش کیا وہیں ذرائع ابلاغ کے ایک بڑے حصے نے جنگوں کی ہلاکتوں اور ان کی انسانیت سوزی کو بھی اجاگر کیا۔ آپ خیال فرمائیں کہ ویت نام کی جنگ میں ذرائع ابلاغ نے کتنا کلیدی کردار ادا کیا۔ جہاں ایک طرف امریکا اور یورپ کی مقتدرہ کے ہمنوا ذرائع ابلاغ تھے جو اشتراکیت کا ہوا دکھا کر ویت نام کے خلاف اپنے ملکوں کی جارحانہ کارروائیوں کو اخلاقی جواز فراہم کرنے کی کوشش کرتے تھے، وہیں دوسری طرف مغرب ہی کے بعض ذرائع ابلاغ نے اس جنگ کی ہولناکیوں اور امریکی بربریت کا نشانہ بننے والے شہریوں کی بے بسی اور ان کی ہلاکتوں کو دنیا کے سامنے پیش کر کے انسانی ضمیر کو بیدار کرنے کا کام کیا۔ اس جنگ کے دوران کا ایک واقعہ ہے کہ جس سے آپ خود بھی بخوبی واقف ہوں گے کہ ویت نام کے ایک گاؤں پر بمباری کے بعد ہونے والی بھاگ دوڑ کی بہت سی تصویروں میں سے ایک تصویر جو ٹیلی ویژن کی اسکرینوں پر دیکھی گئی وہ انسانی ضمیر کے اوپر لگنے والا ایک بہت بڑا کچوکا ثابت ہوئی۔ اس تصویر میں بہت سے لوگ بم گرنے کی جگہ سے بھاگتے دکھائی دیئے۔ ان لوگوں کی تصویر کیمرہ مین نے سامنے سے لی۔

بھاگتے ہوئے ان لوگوں میں سب سے آگے چھ سات سال کی ایک بچی تھی جس کے جسم پر ایک کپڑا بھی نہیں تھا۔ وہ چیختی، چلاتی روتی ہوئی بھاگتی چلی آ رہی تھی اور کیمرے کی آنکھ اس کو ساری دنیا کے سامنے پیش کر رہی تھی۔ ٹیلی ویژن اسکرینوں پر اس تصویر کو دیکھ کر بہت سے امریکی تقریباً پاگل ہو گئے اور اپنے گھروں سے نکل آئے۔ گلیوں اور شاہراہوں پر لوگ ایک دوسرے سے پوچھتے تھے کہ ہم کون سی لڑائی لڑ رہے ہیں اور وہ کون سا عظیم مقصد ہے کہ جو ہم سے یہ سب کروا رہا ہے۔ اس دہلا دینے والے منظر کو دیکھ لینے کے بعد طالب علموں نے کلاسوں میں جانے سے انکار کر دیا۔ یونیورسٹی کے اساتذہ خود بھی بپھر کے باہر نکل آئے اور امریکی حکومت کے خلاف مظاہروں میں تیزی آ گئی۔ ایسا نہیں ہے کہ جنگِ ویتنام کے خلاف اٹھنے والا طوفان صرف اس ایک منظر کا نتیجہ تھا۔ یہ اور ایسے بہت سے مناظر نے مل کر امریکا اور یورپ میں احتجاج کی ایک زبردست لہر کو جنم دیا تھا جس کی زد میں امریکا کے صدر جانسن اور صدر نکسن بھی آئے اور برطانیہ کے وزیرِ اعظم ولسن بھی۔ فرانس کے صدر جنرل ڈیگال بھی اس طوفان کے آگے بند نہ باندھ سکے۔ ان میں سے کئی حکمرانوں کا اقتدار بھی جنگ ویت نام کے خلاف اٹھنے والی اس احتجاجی لہر کی نذر ہوا۔ لیکن جہاں ایک طرف آزاد میڈیا نے سامراجی طاقتوں کو بے نقاب کرنے اور جمہور کی ابتلا کو منظرِ عام میں لانے میں اہم کردار ادا کیا ہے وہیں اب دنیا کی استبدادی طاقتوں نے بھی آزاد میڈیا کو ناکام بنانے کے لیے نئے ہتھکنڈے وضع کر لیے ہیں۔ چنانچہ اب جنگوں کے حوالے سے صحیح اطلاعات کی ترسیل کے راستے میں دو طرح کی بنیادی رکاوٹیں کھڑی کر دی گئی ہیں۔ ایک تو جنگوں کے دوران ایسے قوانین وضع کر دیے جاتے ہیں جن کی رو سے صحافیوں اور رپورٹروں کو میدانِ جنگ سے براہِ راست رپورٹنگ کی اجازت نہیں دی جاتی۔ بلکہ وزارتِ دفاع یا فوج کا کوئی ادارہ خبروں کی چھان پھٹک کے بعد صرف ان خبروں کو مشتہر ہونے کی اجازت دیتا ہے جو اس کی نظر میں ان کے لیے نقصان دہ نہیں ہوتیں۔ خلیج کی دونوں جنگوں میں ہم نے یہی دیکھا کہ وہ سارے مغربی ذرائع ابلاغ جن کو اپنے آزاد ہونے کا ہمیشہ سے دعویٰ رہا ہے کس آمادگی کے ساتھ

امریکی فوجی اداروں کی طرف سے 'کلیئر' کی ہوئی خبروں ہی کو پیش کرتے رہے۔ خبروں کی ترسیل میں حائل ایک رکاوٹ تو یہ تھی لیکن اس سے بڑھ کر ایک اور رکاوٹ ان ذرائع ابلاغ کا خود اپنا یکطرفہ اور نام نہاد حب الوطنی اور جذبہ قومیت سے سرشار انداز و اسلوب ہوتا ہے۔

میں اپنے ذاتی مشاہدے کے حوالے سے ایک مثال آپ کے سامنے پیش کرنا چاہوں گا۔ پہلی گلف وار کے موقع پر اتفاق سے میں انگلستان ہی میں مقیم تھا۔ اس جنگ میں برطانیہ کے کم و بیش سب ہی اخبارات نے جس قومیتی انداز میں خبریں نشر اور شائع کیں اس کا مشاہدہ کر کے مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ یہ ذرائع ابلاغ کن معنوں میں خود کو آزاد اور معروضی قرار دیتے ہیں۔ ان دنوں برطانوی اخبارات میں کم و بیش وہی منظر دیکھنے میں آتا تھا جو ہم جیسے چھوٹے ملکوں کی لڑائیوں میں عام طور سے دیکھنے میں آتا ہے۔ صرف ایک مثال سے آپ اس پاگل پن کا اندازہ لگا سکتے ہیں جس کا برطانوی اخبارات ان دنوں شکار تھے۔ ایک دن جب امریکی و برطانوی فوجیں کویت پر سے عراق کا قبضہ ختم کراتے ہوئے عراقی مورچوں پر قبضہ کر رہی تھیں ان کے ذرائع ابلاغ نے دکھایا کہ کس طرح عراقی فوجی جن کے جوتے ٹوٹ چکے تھے اور کپڑے پھٹے ہوئے تھے اور ان کی ٹین کی پلیٹوں میں ابلے ہوئے چاول پڑے تھے کس طرح خندقوں سے نکالے جا رہے تھے۔ کس طرح امریکی ذرائع نے عراقی فوج کی ذلت آمیز تصویریں شائع کیں جن پر کوئی نہ کوئی سرخ روئی کا فقرہ درج ہوتا تھا۔ دکھانا یہ مقصود تھا کہ ہمارے لڑکے کس طرح عراق میں لڑ رہے ہیں اور فتح پر فتح حاصل کر رہے ہیں۔ جس روز عراقی سپاہیوں کی یہ تصویر برطانیہ کے شام کے اخباروں میں صفحہ اوّل پر چیختی چنگھاڑتی عبارتوں اور سرخیوں کے ساتھ شائع ہوئی تو عراق نے اپنے ٹیلی ویژن پر ایسے دو تین برطانوی پائلٹ پیش کر دیئے جو اپنے جہازوں پر عراقی شیلنگ کے بعد جان بچانے کے لیے پیراشوٹ سے نیچے کود گئے تھے۔ عراق نے ان پائلٹوں کو گرفتار کر لیا تھا۔ ان ہوابازوں کے چہروں پر نیل پڑا ہوا تھا۔ وہ انتہائی پژمردہ نظر آ رہے تھے۔ اس تصویر کے منظرِ عام پر آنے کے بعد برطانوی اخبارات کو یاد آیا کہ جنگی قیدیوں کو یوں منظرِ عام پر لانا جنیوا کنونشن کے خلاف ہے۔

ان اخبارات نے اپنے سپوتوں کی تصویر تو نہیں چھاپی۔ البتہ صدام حسین کی تصویر چھاپ کر اس کے اوپر ایک سے ایک بری سرخی لگائی۔ ایک اخبار کی سرخی مجھے یاد ہے جس میں صدام حسین کی بڑی سی تصویر کے اوپر 'باسٹرڈ آف بغداد' کی جلی سرخی درج تھی۔

سوجنگ اور تاریخ کے موضوع پر بات کرتے وقت ذرائع ابلاغ کے حوالے سے یہ بات ہمارے پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ عام دنوں میں تو ذرائع ابلاغ کا کام مشکل ہوتا ہی ہے جنگ کے دنوں میں یہ کہیں زیادہ مشکل اور صبر آزما ثابت ہوتا ہے۔ بہرحال یہ ایک ایسا موضوع ہے جس پر بہت غور وفکر کی ضرورت ہے اور اس بات کا جائزہ لینے کی بھی اشد ضرورت ہے کہ آزادیٔ صحافت یا ذرائع ابلاغ کی آزادی ایک بہت تہہ در تہہ موضوع ہے جس کے مختلف پہلو ہمیں دعوتِ فکر دیتے ہیں۔

خواتین و حضرات! آج کے اس دوسرے اجلاس میں جو آخری مقالہ پیش کیا گیا وہ ڈاکٹر ریاض شیخ کا تھا۔ جنہوں نے جنگ اور مذہب کے موضوع پر بڑی علمی گفتگو کی۔ یہ موضوع خاصا نازک بھی ہے کیونکہ دنیا میں بے شمار جنگیں مذہب کے نام پر ہوئی ہیں اور مذہب کے نام پر ہونے والی جنگوں میں ہر فریق اپنے آپ کو الوہی طاقتوں کا نامزد کردہ اور ابدی خوشنودیوں کے حصول کا طلب گار باور کراتا رہا ہے۔ مذہب کے نام پر ہونے والی جنگوں میں مادّی اسباب اور مقاصد کو بیان نہیں کیا جاتا بلکہ ان کا کوئی نہ کوئی اخلاقی جواز پیش کیا جاتا ہے۔ ہمارے علمائے مذہب میں بھی بحیثیت مجموعی دو طرح کے رجحانات دیکھے جاسکتے ہیں۔

کچھ علماء جنگوں کو ضروری اور فروغِ مذہب کا ناگزیر ذریعہ سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال میں کفار کے سر قلم کرنا اسلام کی بالادستی کے قیام اور اسلام کی توسیع واشاعت کے لئے ضروری ہے۔ یہی نہیں بلکہ یہ خود مسلمانوں کے لیے اپنے راہِ حق پر ہونے کی دلیل ہے۔ سو وہ بڑے دھڑلے کے ساتھ جنگ بازی اور قتال کی وکالت کرتے نظر آتے ہیں۔ مولانا الطاف حسین حالی جیسے بزرگ اور دین دار شخص نے ایک شعر کہا تھا۔ اس قسم کا شعر شاید کوئی اور شاعر کہتا تو اس کو دہرانے کی جرأت

بھی کوئی مشکل ہی سے کر پاتا۔ لیکن یہ حالی کا شعر ہے جن کو ہم مسدس مدوجزرِ اسلام کے خالق کی حیثیت سے پہچانتے ہیں۔

نہ جانے جنگوں کی یا مذاہب کے نام پر پھیلائے جانے والے فساد کی کون سی یاد تھی جس نے حالی سے یہ شعر کہلوایا۔

بگاڑ مذہب نے جو ہیں ڈالے نہیں وہ تا حشر مٹنے والے
یہ جنگ وہ ہے جو صلح میں بھی یونہی ٹھنی کی ٹھنی رہے گی

ایک جانب جنگوں کے حوالے سے یہ رجحان ہے کہ ملک گیری اور مالِ غنیمت کی ہوس میں کی جانے والی جنگوں کو مذہبی لبادے میں پیش کر دیا جاتا ہے۔ دوسری طرف بعض علمائے فکر ایسے ہیں جنہوں نے یہ رائے قائم کی ہے کہ جہاد کا آغاز تو انسان کے اپنے نفس کی تطہیر سے ہوتا ہے۔ جہاد کے مختلف مدارج ہیں اور یہ صرف آخری درجہ ہے کہ جس میں مسلح معرکہ آرائی کی اجازت دی گئی ہے۔ ڈاکٹر خالد مسعود ہمارے ملک کے ایک اہم مذہبی اسکالر ہیں۔ انہوں نے اپنے ایک مقالے 'اسلام کا تصور جہاد' میں لکھا ہے کہ فاتح اسلامی فوج کو تاکید کی گئی ہے کہ وہ مفتوح علاقے میں بچوں پر، عورتوں پر اور بوڑھوں پر ہاتھ نہ ڈالے۔ یہی نہیں بلکہ جانوروں کا قتل نہ کرے اور فصلوں تک کو تباہ نہ کرے۔ ایک جانب یہ تعلیم ہے اور دوسری جانب ہم دیکھ رہے ہیں کہ ایک فرقے کے انتہا پسند کس طرح دوسرے فرقے کے پیروکاروں کے خلاف نبرد آزما ہیں۔ کس طرح وہ مذہبی عبادت گاہوں پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ کس طرح لوگوں کو چن چن کر ہلاک کیا جاتا ہے اور یہاں تک کہ جنازوں تک کو نہیں چھوڑا جاتا، ان پر بھی حملے کیے جاتے ہیں۔ لیکن کسی بھی فرقے کے نمائندوں سے بات کریں تو وہ بیک زبان ہو کر اسلام کے پُر امن ہونے، اتحاد بین المسلمین اور اسلامی بھائی چارے کی باتیں کرتے نہیں تھکیں گے۔

خواتین و حضرات! آج کے اس اجلاس میں بہت سے سوالات ہوئے اور ہمارے مقررین نے ان کے جواب بھی دیئے۔ ایک سوال جو ہمارے دوست، بی بی سی کے وسعت اللہ خان نے

پوچھا ہے کہ جنگ کا اصل محرک کیا ہوتا ہے؟ کیا یہ انسان کی جبلت ہے، اس کی ہوس اور لالچ ہے اس کا جذبۂ انتقام ہے جو جنگ پر منتج ہوتا ہے؟

میری گزارش یہ ہے کہ جنگیں عام طور سے اقتصادی مقاصد سے لڑی جاتی ہیں۔ ان کو قومی غیرت یا مذہبی عصبیت کا ملمع چڑھا دیا جاتا ہے لیکن یہ دراصل ہوتی اقتصادی مفادات کے لیے ہی ہیں۔ اس کے علاوہ جو دیگر چیزیں اس میں مددگار ہوسکتی ہیں ان میں تاریخی طور پر پروان چڑھنے والا عصبیت یا انتقام کا جذبہ، جھوٹے تفاخر کا احساس یا دوسرے لوگوں پر غلبہ حاصل کرنے کی آرزو ہوتی ہے۔ اجتماعی طور پر یہ چیزیں متشکل ہوں تو یہ ملکوں کی پالیسیوں میں ڈھل جاتی ہیں۔ انفرادی طور پر دیکھا جائے تو یہ رجحانات فرد کی شخصیت کا حصہ بن کر اس کو معاشرے کے لیے مشکلات کا سبب بنا دیتی ہیں۔ تشدد کے حوالے سے بات کریں یا مزاج کی تیزی یا شدت کی بات ہو تو اس کے دو اسباب ہوسکتے ہیں۔ میں عرض کروں گا کہ ایک مرتبہ میں نے ڈاکٹر ڈی کی حسن صاحب سے جو کہ آپ جانتے ہیں کہ ہمارے ملک کے ایک بہت بڑے ماہر نفسیات تھے، یہ پوچھا تھا کہ تشدد کا یا نفرت کا جذبہ انسان کو جبلی طور پر حاصل ہوتا ہے یا یہ حالات کی دین ہوتا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ زیادہ تر تو یہ اردگرد کے ماحول اور حالات کا دیا ہوا اور پروان چڑھایا ہوا رجحان ہوتا ہے لیکن کسی حد تک یہ پیدائشی طور پر بھی انسان کے اندر موجود ہوسکتا ہے۔ لیکن ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ پیدائشی طور پر جو خصوصیات حاصل ہوتی ہیں وہ بعد میں معاشرت اور ماحول کے نتیجے میں بدلی بھی جاسکتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بقول ڈاکٹر ڈی کی حسن، ہم نفسیاتی امراض کے حامل لوگوں کا علاج کرتے وقت ماحول کی تبدیلی کے ذریعے اصلاح کو بہت ضروری بلکہ اوّلین طریقۂ علاج سمجھتے ہیں۔

محترم خواتین و حضرات! آخر میں، میں یہ عرض کروں گا کہ آج صبح کے اجلاس اور موجودہ اجلاس دونوں میں پیش کردہ مقالات میں بہت سے ایسے موضوعات سامنے آئے ہیں جن پر مشتمل ہم ایک فہرست بنا سکتے ہیں اور اگر آپ مناسب سمجھیں تو اس کو آج کی کانفرنس کے نتیجے میں سامنے آنے والے 'ریسرچ ایجنڈے' کے طور پر زیرِ غور لایا جاسکتا ہے۔ پہلی بات تو یہ ہمارے

سامنے آئی ہے کہ جنگ اور تاریخ کے تعلق سے ہونے والی گفتگو میں ایک عام آدمی کا تصور بجائے خود تحقیق کا ایک اہم موضوع ہوسکتا ہے۔ جنگیں شہریوں پر کیا اثرات مرتب کرتی ہیں، ہلاکتیں، خاندانوں کو کس طرح بحرانوں کا شکار بناتی ہیں۔ جنگوں میں ہلاک ہونے والوں کے بچے بعد میں کس طرح زندگی گزارتے ہیں۔ بیواؤں کی زندگیاں کس طور گزرتی ہیں یا پھر جیسے کہ صبح کے اجلاس میں ڈاکٹر ٹیپو سلطان نے ایک اہم موضوع کی طرف ہماری توجہ مبذول کروائی کہ جنگوں کے نتیجے میں ہاتھ پاؤں یا دوسرے جسمانی اعضا سے محروم ہو جانے والے بعدازاں کس طرح زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہ سب چیزیں تفصیلی تحقیقی سروے، ریسرچ یا زبانی تاریخ نویسی کا بڑا مفید مواد فراہم کرتی ہیں۔

اگر ہم یہی دیکھ پائیں کہ جنگوں میں کام آنے والے سپاہی مرتے وقت اپنے آس پاس کیا چھوڑ کے مرتے ہیں تو ہوسکتا ہے کہ ہمیں ان کی جیبوں میں گھر والوں کے خط ملیں یا ان کے بٹوؤں میں ان کے بچوں، بیویوں یا ان کی محبوباؤں کی تصویریں مل جائیں۔ یہ سب چیزیں تاریخ کا بڑا اچھا مواد بن سکتی ہیں۔ ابھی چند روز پہلے جرمنی کے ایک پروفیسر ہمارے ہاں تشریف لائے تھے۔ وہ یہاں کچھ تحقیق کر رہے تھے۔ ایک روز انہوں نے اپنی کتاب مجھے عنایت کی جو پہلی جنگِ عظیم میں ہندوستان سے بھرتی ہو کر برطانوی فوج میں شامل ہونے والے ان فوجیوں کے ترکے کی بنیاد پر لکھی گئی تھی جو دورانِ جنگ جرمنی کے قبضے میں آ گئے تھے اور انہیں جرمنی کی جیلوں میں ڈال دیا گیا تھا۔ وہاں جیل کے قواعد کے مطابق انہیں وقت گزاری کے لیے کاغذ اور قلم دے دیا جاتا تھا۔ چنانچہ ہندوستانی قیدیوں نے وہاں کاپیوں پر جو کچھ لکھا وہ ان کی فوری کتھارسس کا ذریعہ بنا ہوگا یا کم از کم اس نے وقت کاٹنے میں ان کی مدد کی ہوگی۔ رہائی پر وہ یہ سب کچھ وہیں چھوڑ آئے جس کو بعد میں جیلوں کی انتظامیہ نے آرکائیوز کی شکل میں محفوظ کر لیا۔ اب یہ کاپیاں بہت کچھ بیان کرتی ہیں۔ ان سپاہیوں نے جرمنی کی قید میں اپنے گھروں کو کس طرح یاد کیا۔ ان کے گاؤں، ان کی یادوں میں لوٹ لوٹ کر آتے رہے۔ یہ سب تفصیلات ان کاپیوں کے اندراجات میں موجود

ہیں۔ ہم بھی اس طرح کی چیزیں تلاش کر سکتے ہیں اور جو جنگیں ہمارے ہاں ہوئی ہیں ان میں اس طرح کا مواد یہ دکھانے کے لیے بہت کارآمد ہوگا کہ ملکوں اور حکومتوں کے مؤقف اور دعوے اپنی جگہ مگر خود جنگوں کا نوالہ بننے والے سادہ لوح غریب انسان خود کیا سوچتے تھے، ان کی آرزوئیں کیا تھیں انہوں نے زندگی میں کیا خواب دیکھے تھے۔ ان کی اپنے بچوں کے لیے وصیتیں کیا تھیں، وہ اپنی اولاد کے لیے کس طرح کی دنیا کا خواب دیکھ رہے تھے۔

جنگ اور تاریخ کے حوالے سے ہم حقوقِ انسانی کے موضوع پر بھی تحقیقات کر سکتے ہیں۔ بہت سے موضوعات ذرائع ابلاغ کی نسبت سے بھی ذہن میں آتے ہیں اور مذہب اور جنگ کے تعلق یا عدم تعلق پر بھی بہت کچھ سوچنے، لکھنے اور تحقیق کرنے کی ضرورت ہے۔

آخر میں، میں یہ کامیاب کانفرنس منعقد کرنے پر SZABIST اور ادارۂ تاریخ کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ خاص طور سے میں ڈاکٹر مبارک علی صاحب کو خراجِ تحسین پیش کرنا چاہتا ہوں جن کی انتھک محنت اور مسلسل جدوجہد کے نتیجے میں تاریخ کا موضوع اب پیشہ ور مؤرخوں کے حلقے سے باہر نکل کر عام لوگوں تک پہنچ چکا ہے۔ ان کے رسالے کے ۴۴ شمارے شائع ہو چکے ہیں اور ان کی سرپرستی میں ۱۴ کانفرنسیں بھی منعقد ہو چکی ہیں۔ ملک کے مجموعی حالات کے تناظر میں یہ کوئی معمولی کامیابیاں نہیں ہیں۔ ان سب کاموں کو دیکھیں تو کم از کم مایوسی کا کوئی جواز ہمیں نظر نہیں آتا۔

☆☆☆

سترہویں صدی میں مشرق و مغرب کی دو عورتیں

زاہدہ حنا

تاریخ کے تناظر میں عورت کی ذہانت اور اس کی کارگزاری کا حساب لگانے بیٹھیے تو مختلف زمانوں میں صرف چند عورتیں دکھائی دیتی ہیں جو نام دار تھیں' نمودار تھیں' ورنہ ہر طرف ہُو کا مکان ہے اور اس میں ہندو' یہودی' عیسائی اور مسلمان عورت کی خاک اڑتی ہے۔ یقین نہ آئے تو ان مذاہب سے تعلق رکھنے والے بیسویں اور اکیسویں صدی کے لکھنے والوں اور لکھنے والیوں کی کتابیں پڑھیے۔ ان کی جستجو کو داد دیجیے جو قبل مسیح اور بعد مسیح کے زمانوں سے ان ذہین اور خلاق عورتوں کو ڈھونڈ لائے ہیں چند دہائیوں پہلے جن کے نام سے بھی کوئی واقف نہ تھا۔

یہ المیہ نہیں تو اور کیا ہے کہ رحمِ مادر سے وجود میں آنے والے مردوں کا تاریخ نے تِل تِل حساب رکھا لیکن ہر دور کی ذہین اور تخلیقی صلاحیتوں سے مالا مال عورت یوں فراموش کر دی گئی جیسے وہ کبھی موجود ہی نہیں تھی۔

اس بات پر حیران نہ ہوں اس لیے کہ ہم جب بیسویں صدی کی 30ء اور 40ء کی دہائی میں اسپین کی خانہ جنگی کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں ان عورتوں کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا جنہوں نے خانہ جنگی کے ابتدائی دنوں میں اپنا نام پاپولر فرنٹ ملیشیا میں درج کرایا تھا اور جنہوں نے بہ طور نرس محاذِ جنگ پر اپنی خدمات انجام دیں' جنہوں نے سپاہیوں کے لیے کھانے پکائے' ان کی تیمارداری کی' محاذ جنگ پر خوراک پہنچانے کا خطرناک کام کیا۔ ان میں سے جو محاذ پر نہیں گئیں انہوں نے جنگ کے لیے شہروں میں چندہ اکٹھا کیا' بے گھر ہونے والوں کی دیکھ بھال کی' جلسوں میں تقریریں کیں' مظاہرے کیے' اخباروں میں مضامین لکھے تاکہ عام شہریوں کو جنرل فرانکو کی فاشسٹ حکومت کے

مظالم سے اور اس کے خلاف لڑنے والوں کی بے جگری اور بہادری سے آگاہ کر سکیں۔ لیکن صرف چند برسوں میں وہ یوں بھلا دی گئیں جیسے ان کا وجود ہی نہ تھا۔ 1991ء میں ان بھلا دی جانے والیوں کے خطوط' ڈائریوں اور مضامین کو تلاش بسیار کے بعد ایک مجموعے Women,s Voices from the Spanish Civil War کی صورت میں سامنے لایا گیا۔ اس کتاب کے بعد وہ فراموش ہو جانے والیاں پہلی مرتبہ یاد کی گئیں۔ آج جب ریڈیو' اخبارات' کتابوں اور ٹیلی وژن سے معلومات کا ایک سیل رواں ہے۔ ایسے زمانے میں صرف پچیس تیس برس کے اندر یہ عورتیں فراموش کر دی گئیں تو دو چار صدیوں اور ہزاروں برس پہلے گزرنے والی عورتوں کا ذکر ہی کیا۔

سترہویں صدی میں سانس لینے والی مشرق و مغرب کی دو نہایت ذہین اور اعلیٰ تخلیقی صلاحیتیں رکھنے والی عورتوں کا ذکر ان کا حق ہے جنہوں نے اپنے عہد میں ایک ہلچل مچا رکھی تھی لیکن پھر وہ پیش منظر سے پس منظر میں یوں دھکیلی گئیں کہ ان کا سطر' دو سطر کا صرف تذکرہ رہ گیا اور یاد فراموشی کی ریت نے انہیں یوں نگل لیا جیسے وہ کبھی موجود ہی نہیں تھیں۔ انیسویں اور بیسویں صدی کے مورخوں اور سوشل سائنس دانوں کو داد دیجئے کہ انہوں نے مغرب کے کتب خانوں میں محفوظ بھولے بسرے اور متروک مخطوطوں میں سے انہیں ڈھونڈ نکالا اور پھر لگ بھگ ایک صدی کی تحقیق اور تفتیش سے ان کے خدوخال ہمارے سامنے اجاگر ہوئے ہیں۔

ان میں سے پہلی اورنگزیب عالم گیر کی سب سے بڑی بیٹی شہزادی زیب النساء ہے جو 15 فروری 1638ء کو پیدا ہوئی۔ وہ دل رس بانو بیگم رابعہ دورانی اور شہزادہ اورنگ زیب والیٔ دکن کی پہلی اولاد تھی۔ وہ پیدا ہوئی تو ہندوستان پر اس کے دادا شہنشاہ شاہ جہاں کی حکمرانی تھی اور ممتاز محل سنگ مرمر سے تراشے جانے والے تاج محل میں سوتی تھی۔ شاہ جہاں نے اپنی اس پوتی کا نام زیب النساء رکھا۔ اس کا نانا شاہ نواز خان صفوی تھا جو صوبہ گجرات کا گورنر تھا جس کا سلسلۂ نسب شاہ اسماعیل صفوی سے ملتا ہے۔ باپ کی طرف سے اس کی رگوں میں چنگیزی اور تیموری خون دوڑتا تھا اور ماں کی طرف سے اس کا سلسلۂ نسب ایران کے شاہانِ صفوی سے تھا۔ وہ اپنے عہد کے دو اہم ترین مشرقی شاہی خانوادوں کا عطر تھی اور اسی نسبت نے اس کے مزاج پر گہرے اثرات مرتب کیے۔

اس نے اپنے پردادا شہنشاہ اکبر جیسی بے مثال یادداشت پائی تھی' شاید یہی وجہ ہے کہ تین برس کی عمر میں اسے قرآن کی متعدد آیات یاد ہو چکی تھیں۔ مسلمانوں کی روایت کے مطابق چار برس' چار ماہ اور چار دن کی عمر میں اس کی رسم بسم اللہ ہوئی اور اسے ایک ایسی حافظۂ قرآن مریم کے سپرد کر دیا گیا جو نیشا پوری تھی اور اپنے شوہر شکر اللہ کشمیری کے ساتھ ہندوستان آئی تھی۔ زیب النساء نے سات برس کی عمر میں قرآن حفظ کر لیا تو شہزادہ اورنگ زیب کے لیے پہلی اولاد کے حوالے سے یہ ایک یادگار واقعہ تھا۔ لڑکیوں کے حفظِ قرآن پر اس طرح خوشی نہیں منائی جاتی تھی لیکن اورنگ زیب نے اس موقع پر ایک شاندار تقریب منعقد کی اور اسے یادگار بنا دیا۔ اورنگ زیب کی بے پایاں مسرت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ حافظہ مریم کو 30 ہزار اشرفیاں بہ طور انعام دی گئیں اور غریبوں میں بڑے پیمانے پر روپے تقسیم کیے گئے۔

حافظہ مریم نے زیب النساء کی ابتدائی تعلیم میں حصہ لیا لیکن اس کی باقاعدہ تعلیم شروع ہونے کا مرحلہ آیا تو اورنگزیب نے صرف ونحو کی تعلیم کے لیے ملا جیون کو مقرر کیا' جس کے بعد اس نے ملا سعید اشرف مازندرانی سے 14 برس تک مختلف علوم حاصل کیے۔ ملا مازندرانی نے ہی اسے شعر فہمی کے نکات تعلیم کیے۔ اس نے عربی میں بھی شعر کہے لیکن پھر فارسی کا دامن تھام لیا۔ فارسی اس کی مادری اور مغل دربار کی زبان تھی اور اس میں شعر کہنے کی مشق اس نے چھ برس کی عمر سے شروع کر دی تھی۔ اس دوران اس نے فارسی' عربی' سنسکرت اور ہندی میں مہارت بہم پہنچائی اور خطاطی اس نے اپنے استاد کے علاوہ اپنے چچا اور شاہ جہاں کے لاڈلے شہزادے دارا شکوہ سے سیکھی۔ وہ حساب' جغرافیہ' شہسواری' نیزہ بازی اور شمشیر زنی میں اپنے بھائیوں اور کسی بھی ہم عمر عم زاد سے کم نہ تھی۔ یہ تیموریوں اور مغلوں کا معمول تھا کہ وہ اپنی خواتین کو شکار کے دوران اور میدان جنگ میں ساتھ رکھتے تھے۔ اسی لیے مغل شہزادیوں پر لازم تھا کہ وہ شہسواری میں طاق ہوں اور شیر کا شکار اپنی تلوار سے کر سکیں۔

ابتدائی عمر سے ہی پنج تنتر کتھا' حکایات بیدپائے اور حافظ کی شاعری اس کا دل لبھاتی تھی۔ اورنگزیب نے دکن کے صوبے دار کے طور پر اور بعد میں جب وہ تخت طاؤس پر جلوہ افروز ہوا تب بھی دیوان حافظ کو لڑکوں کے لیے مدارس میں اور محلات میں بیگمات کے لیے ممنوع قرار دیا تھا لیکن زیب النساء پر یہ پابندی عائد نہیں کی گئی تھی اور وہ دیوان حافظ کا نہ صرف مطالعہ کرتی تھی بلکہ

یہ دیوان ہمہ وقت اس کے ساتھ رہتا تھا۔ اورنگزیب کو شاعری اور وہ بھی شہزادیوں کی شاعری سخت ناپسند تھی۔ اس کے باوجود یہ بھی زیب النساء تھی جسے اورنگزیب نے شعر کہنے سے روکنے کی کوشش نہ کی اور زیب النساء نے بھی باپ کے احترام میں اپنی شاعری کو پس پردہ رکھا۔ شاید ''مخفی'' کا تخلص بھی اس نے اسی لیے اختیار کیا۔

شہزادی زیب النساء کو درباری سازشوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی اور وہ اپنے لیے مطالعے کو دنیا کا سب سے پسندیدہ شغل سمجھتی تھی۔ وہ دولت آباد کے محلوں میں اپنی کتابوں، کشمیری کاغذ کے پلندوں اور قلم دوات کی دوسراہت میں بڑی ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی وہ اپنے باپ شہزادہ اورنگزیب اور اپنے بھائیوں کے ساتھ مرغزاروں میں شکار بھی کھیلتی۔

اورنگزیب اس کی ذہانت اور کثرت مطالعہ کی وجہ سے اس کے علم و دانش پر ناز کرتا تھا اور جب وہ بچی تھی تو اکثر ایسا بھی ہوتا کہ وہ اپنے امراء کے درمیان زیب النساء کو کسی حکایت کے سنانے کا حکم دیتا۔ وہ دولت آباد کے محلوں میں پھرتی، گوالیار کے قلعے کی بھی اس نے سیر کی تھی۔ اس بات سے آگاہ تھی مان سنگھ کے بنوائے ہوئے اس قلعے میں کتنے ہی مغل شہزادوں نے اپنی زندگی کے دن قید میں گزارے تھے۔ اسے تاریخ سے گہری دلچسپی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اقتدار کی خواہش اور اس کے لیے کی جانے والی سازشوں نے اس کے خاندان کے کتنے ہی ذہین اور باصلاحیت شہزادوں کو دہائیوں تک آسمان کی جھلک دیکھنے سے محروم رکھا تھا اور آزادی کے لیے ترستے ہوئے انہوں نے قیدِ جاں سے رہائی پائی تھی۔ ان تاریخی حقائق نے اس جیسی حساس اور دردمند لڑکی کو پہروں مضطرب رکھا ہوگا۔

زیب النساء کی زندگی کا دھارا اس وقت بدل گیا جب اس نے اپنے چہیتے باپ شہزادہ اورنگزیب، ماں شہزادی دل رس بانو اور اپنے چھوٹے بھائی بہنوں کے ساتھ آگرہ کا سفر کیا جہاں اس کے دادا شاہ جہاں کی حکمرانی تھی۔ زیب النساء نے اپنے دادا کے بنوائے ہوئے تاج محل کے سیر کی، آگرہ کا قلعہ اور محلات دیکھے جہاں کے دربار اور دکن کے درمیان زمین و آسمان کا فرق تھا۔ یہ اس کے باپ اور دادا کے مزاجوں کا تفاوت بھی تھا اور اس بات کا بھی کہ دکن ایک صوبہ تھا جہاں اس کے باپ کی حکمرانی تھی اور آگرہ پایۂ تخت تھا جہاں شہنشاہ ہند حکمرانی کرتا تھا۔ آگرہ کے بعد وہ اپنے دادا کے ہمرکاب دلی گئی جہاں لال قلعہ اور تخت طاؤس تھا اور مغل جاہ و جلال نصف النہار پر پہنچ

چکا تھا۔

آگرے اور دلی میں ہیرے' جواہرات اور مال و دولت کی جو چکا چوند تھی اس نے زیب النساء کو لبھایا لیکن علوم اور شاعری سے اس کا جو رشتہ ابتدائے عمر میں قائم ہوا تھا وہ آگرہ اور دلی پہنچ کر کمزور ہونے کی بجائے گہرا ہوتا چلا گیا۔ یہاں وہ کتابیں تھیں جو اس کے بادشاہ اور شہنشاہ دادا' پردادا اور سگڑ دادا جمع کر چکے تھے۔ یہاں اکبر کے دارالترجمہ کی روایت تھی' شہزادہ داراشکوہ کی علمی اور ادبی محفلیں تھیں۔ ایران' افغانستان اور ترکستان سے مشرق کی اعلیٰ ذہانتیں ہندوستان کھنچی چلی آ رہی تھیں۔ یہاں آنے والے کاروان صرف سامان تجارت ہی نہیں لا رہے تھے۔ نادر جواہرات کی صندوقچیوں اور چینی ریشم کی گٹھریوں کے ساتھ ہی نئے خیالات کے پشتارے بھی یہاں کھل رہے تھے۔ زیب النساء کے اردگرد چینی' ترک' پرتگیزی' آرمینی اور جارجین کنیزیں تھیں جو ذہانت اور حاضر جوابی میں طاق تھیں' شاعری' موسیقی اور عالمی ادب کی شناوری جن کا ہنر تھی اور اسی ہنر مندی کی سیڑھیاں طے کرتی ہوئی وہ بادشاہوں' شہزادوں اور امراء کے دل تک پہنچتی تھیں۔ یہاں وہ خواجہ سرا تھے جن کی سازشوں اور جاسوسی کے جال سے مغل شہزادے اور جہاں آراء اور روشن آراء جیسی مختار کُل شہزادیاں بھی چوکنا اور خبردار رہتی تھیں۔

یہاں اس کی ملاقات اپنے چچا داراشکوہ سے ہوئی جسے اس کا چہیتا باپ ناپسند کرتا تھا۔ وہ اپنے سب سے بڑے بھائی کے بارے میں جس وضع کے ناپسندیدہ خیالات رکھتا تھا ان سے زیب النساء آگاہ تھی۔ یہاں جب اس پر داراشکوہ کا علمی تبحر اور ادبی ذوق آشکار ہوا تو اسے حیرت ہوئی۔ داراشکوہ نے اسے خطاطی کا درس دیا اور پھر اسے اپنے استاد آقا عبدالرشید دیلمی کے سپرد کیا۔ دارا کا کہنا تھا کہ زیب النساء میں خطاطی کی بے پناہ صلاحیتیں ہیں۔ یہ دارا تھا جس نے اس کو سلسلۂ قادریہ کے صوفیا سے متعارف کرایا۔ اسے مراقبے اور ذکر کی باریکیوں سے آگاہ کیا۔ اس کی پھوپھیوں جہاں آراء اور روشن آراء نے اسے نقش بندی' قادری' چشتی' سہروردی اور شطاری سلسلوں سے آشنا کیا۔ یہ آگرہ اور دلی کے شب و روز تھے جہاں اس نے رقص و موسیقی کی محفلوں میں شرکت کی اور یہیں اس کے سامنے تصوف' شاعری اور میناطوری مصوری کے نئے اسرار آشکار ہوئے۔ دارا نے اسے میناطوری مصوری کا وہ مشہور مرقع دکھایا جس میں اس عہد اور اس سے پہلے کے نامور میناطوری مصوروں کے 70 سے زیادہ شاہکار تھے۔ اس مرقع کو دارا نے اپنی بیگم شہزادی

نادرہ کے نام معنون کیا تھا۔ شاید چچا کے اس مرقع نے ہی زیب النساء کو ترغیب دی کہ وہ بیش قیمت مینا طوری تصویروں کو حاصل کرے اور انہیں ترتیب دے۔

زندگی زیب النساء کے لیے ابھی تک رنگ ونور سے معمور ایک ہوشربا اور طلسماتی کہانی تھی۔ محل کی ہم عمر شہزادیوں اور اپنی پھوپھیوں شہزادی جہاں آرا اور شہزادی روشن آراء کے شب و روز کی ہنگامہ خیزیوں میں حصہ داری اس کا دل لبھانے کے ساتھ ہی اس کی مجبوری بھی تھی کہ یہ سب کچھ آداب شہزادگی میں سے تھا۔ اس کے باوجود وہ ان ہنگاموں کے حاشیوں پر رہتی اور جب بھی اسے موقع ملتا وہ اپنی کتابوں اور شعر وسخن کی محفلوں میں پناہ لیتی۔ وہ وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود پر لکھی جانے والی کتابوں کا مطالعہ کرتی اور اپنے وقت کے علماء سے تصوف کے معاملات پر تبادلۂ خیال کرتی۔

14 برس کی عمر میں وہ باپ کے ساتھ ایک بار پھر عازم دکن ہوئی۔ 1652ء سے 1657ء کا بیشتر عرصہ اس نے اپنے باپ کے ساتھ دکن میں گزرا۔ 1657ء میں شہزادی زیب النساء کو اس وقت تک کی زندگی کا سب سے بڑا صدمہ اس وقت پہنچا جب اس کی ماں دل رس بانو بیگم نے ستمبر 1657ء میں انتقال کیا اور اپنی آخری نشانی شہزادہ اکبر سلطان کو دنیا میں چھوڑ گئی۔ زیب النساء کی عمر اس وقت صرف 19 برس تھی لیکن اس نے اپنے یسیر بھائی کو یوں سینے سے لگایا جیسے وہ اس کی اپنی اولاد ہو۔ ماں سے جدائی کا صدمہ اپنی جگہ تھا لیکن اس وقت زیب النساء کو اس بات کا احساس نہ تھا کہ یہ 1657ء کا سال ہے جس کا تاریک سایہ زندگی کی آخری سانس تک اس کے وجود پر پڑتا رہے گا۔

1657ء میں ہی شاہ جہاں کی موت کی جھوٹی خبر کے ساتھ تختِ طاؤس پر قبضے کی وہ خونی جنگ شروع ہوئی جس میں آخر کار اورنگزیب نے فتح پائی اور مئی 1658ء میں وہ ہندوستان کے تخت پر متمکن ہوا۔ یہ عرصہ زیب النساء نے دولت آباد میں مضطرب اور ملول کیفیت میں گزارا۔ وہ اپنے باپ کی جان کی خیر مناتی رہی لیکن اسے اپنے تینوں چچا بھی عزیز تھے۔ دولت آباد میں زیب النساء کو پل پل کی خبر ملتی رہی۔ باپ بادشاہ ہوا تو اسے خوشی ہوئی لیکن یہ خبر اس کے لیے اندوہناک تھی کہ اس کا مہربان اور محترم دادا شاہ جہاں آگرہ کے ایک محل میں قید ہوا۔ اس کی ماں جیسی مہربان پھوپھی شہزادی جہاں آرا اپنے وظیفوں اور جاگیروں سے محروم کی گئی اور چہیتے باپ کے

ساتھ زندانی ہوئی۔ اس کے وہ خونی رشتے جنہوں نے جاں نشینی کی جنگ میں شہزادہ داراشکوہ کا ساتھ دیا تھا وہ سب معتوب ہوئے۔

بادشاہ اورنگزیب نے اپنے بچوں کو دولت آباد سے دلی طلب کیا کہ وہ بھی اپنے باپ کے جشن فتح میں شامل ہوں۔ زیب النساء اپنے شیر خوار بھائی شہزادہ اکبر سلطان کو سینے سے لگائے ہوئے مارچ 1659ء میں دلی میں داخل ہوئی۔ باپ نے اسے ''پادشاہ بیگم'' کا خطاب دیا۔ یہ اس بات کا اعلان تھا کہ اب وہ مغل سلطنت کی خاتونِ اول ہے۔ اس سے پہلے یہ منصب اس کی پھوپھی شہزادی جہاں آرا کے پاس تھا اور وہ شاہی خاندان اور امراء کی توجہ کا مرکز تھی۔ اب یہ منصب شہزادی زیب النساء کے حصے میں آیا تھا۔ اکیس برس کی عمر میں کوئی لڑکی ''پادشاہ بیگم'' بنادی گئی ہو' جاہ وحشمت اس کے در دولت کی باندیاں ہوں تو اس کو ان بلندیوں پر ناز کیوں نہ ہو۔ لیکن شہزادی زیب النساء کے خمیر میں غرور اور جاہ طلبی نام کو نہ تھی۔ ابھی وہ اپنے دادا اور پھوپھی کی بدبختیوں پر دل زدہ تھی کہ خبر آئی کہ اس کا چچا داراشکوہ اپنے بیٹے شہزادہ سپہر شکوہ کے ساتھ گرفتار ہوا اور دونوں قتل کر دیے جائیں گے۔ یہ وہی سپہر شکوہ تھا جس سے جہاں آراء کی خواہش رہی تھی کہ شہزادی زیب النساء کی شادی کر دی جائے۔ شہزادی نے ''پادشاہ بیگم'' ہوتے ہی اپنے نانا شاہ نواز خان صفوی کے قتل کا حکم منسوخ کرانے کے لیے تین دن تک مسلسل فاقہ کیا تھا اور قتل کی سزا منسوخ کرائی تھی لیکن وہ اپنے چچا شہزادہ داراشکوہ کے قتل کی سزا منسوخ کرانے کے لیے اُف تک نہ کر سکی' وہ جانتی تھی کہ ایک میان میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں۔ لوگ شہزادہ داراشکوہ کو شاہ جہاں کا جائز وارث خیال کرتے تھے۔ اس کے زندہ رہنے کا مطلب یہ تھا کہ اس کے باپ اورنگزیب کے سر پر ہمیشہ بغاوت کی تلوار لٹکتی رہے گی۔ وہ اپنے باپ کی بے مہری اور داراشکوہ سے اس کی گہری نفرت سے بہ خوبی آگاہ تھی۔ پھر اسے خبر ملی کہ اس کے دانش جُو اور فراخ دل چچا کا سر تحفے کے طور پر اس کے دادا کے سامنے خوان میں سجا کر بھیجا گیا جسے دیکھ کر شاہ جہاں بے ہوش ہوا اور جہاں آراء اپنے چہیتے بھائی کے لیے آہ و بکاہ کرتی رہی۔ اس نے یہ بھی سنا کہ پھر وہ سر آگرہ بھیجا گیا جہاں اس کی دادی ممتاز محل کی قبر کھولی گئی اور اس کے چہیتے بیٹے کا خون آلود سر اس میں رکھ دیا گیا۔

اکیس برس کی شہزادی زیب النساء جیسی ذہین اور حساس لڑکی کے لیے یہ واقعات جاں کاہ تھے۔ اب تک وہ اپنے باپ سے غیر مشروط محبت کرتی رہی تھی اور اس حقیقت سے آگاہ تھی کہ اس کا

باپ بھی اس سے گہری وابستگی رکھتا ہے لیکن تخت طاؤس کی خاطر اورنگزیب نے اپنے باپ' بھائیوں اور بہن کے ساتھ جس سنگ دلی اور شقاوت کا مظاہرہ کیا تھا' اس نے زیب النساء کے ذہن مین اپنے باپ کی پہلے سے مختلف ایک شبیہ ضرور بنائی ہوگی۔ یہ اقتدار کی خواہش میں گرفتار ایک منتقم المزاج بیٹے اور بھائی کی تصویر تھی جو شومئی قسمت سے اس کا باپ تھا۔ زیب النساء کے لیے یہ بھی ایک بڑا صدمہ تھا کہ شہنشاہ اورنگ عالم گیر نے شہنشاہ اکبر کے اپنی ہندو رعایا کے ساتھ فراخ دلی اور حسن سلوک دونوں پر خط تنسیخ پھیرتے ہوئے ان پر جزیہ عائد کر دیا۔ دربار میں شاعروں کی پذیرائی ختم ہوئی۔ روشن خیال عالمانہ اور صوفیانہ بحثیں موقوف ہوئیں۔ موسیقی اور موسیقاروں پر قدغن لگی اور مغل دربار جو اپنی وسیع القلبی اور مختلف علوم وفنون کی سرپرستی کے لیے مشرق ومغرب میں مشہور تھا' وہاں سے یہ خوبیاں رخصت ہوئیں۔ مغل دربار پر شیعیت اور اعزا داری کے گہرے اثرات تھے۔ زیب النساء محرم میں سیاہ پوش ہوتی اور ماتم داری میں حصہ لیتی لیکن اورنگزیب کے لیے یہ ناقابل برداشت تھا کہ اس کی بیٹی ان رسوم میں حصہ لے جو اس کے خیال میں بدعت تھے۔ چنانچہ زیب النساء کو عزاداری سے بھی کنارہ کرنا پڑا۔

زیب النساء کے سامنے ''پادشاہ بیگم'' ہونے کے بعد دو ہی راستے تھے۔ ایک یہ کہ وہ دربار کی سیاست میں حصہ لیتی اور اپنے شہنشاہ باپ کو اس کی پسند کے سیاسی مشورے دیتی اور بعض حالت میں اس کی جنگی مہموں میں اس کے ساتھ رہتی لیکن یہ اس کے مزاج کے خلاف تھا۔ وہ دکن کی شیعہ ریاستوں' مرہٹوں اور راجپوتوں پر لشکر کشی کی بجائے مفاہمت کے عمل کو فوقیت دیتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ ہندوستان جیسی عظیم سلطنت پر حکومت کے لیے تعصب اور جنگ جوئی کی راہ جانا مناسب نہیں۔ اپنے ان خیالات کے باوجود وہ جانتی تھی کہ اپنے سخت گیر اور سفاک باپ کے فیصلوں پر کسی بھی طرح اثر انداز نہیں ہو سکے گی۔

یہی وجہ تھی کہ اس نے علم وادب اور شاعری سے دل لگایا۔ وہ لاہور اور کشمیر کے اسفار میں اپنے باپ کی ہم رکاب رہی جو اس کے منصب ''پادشاہ بیگم'' ہونے کے لیے لازمی تھا۔ لیکن دکن پر ہونے والی لشکر کشی یا شیواجی سے ہونے والے محاربوں کے حاشیوں پر اس نے نظر آنے سے گریز کیا اور اپنا وقت دلی' آگرے' لاہور اور کشمیر میں گزارتی رہی۔ اس کی دو قریبی کنیزیں ارادت فہم اور نوبہار تھیں۔ ارادت فہم کے حوالے سے متعدد تذکروں میں یہ تحریر ہے کہ اس کے ہاتھ سے

شہزادی کی بیاض حوض میں گر گئی اور اس میں لکھے ہوئے لفظ دھل گئے۔ یہ سنگین جرم تھا لیکن زیب النساء کے استاد ملا سعید اشرف مازندانی نے 23 اشعار کا ایک قطعہ ارادت فہم کی سفارش کے طور پر تحریر کیا۔ جسے پڑھ کر شہزادی نے اپنی کنیز کو معاف کر دیا۔

زیب النساء کی زندگی کسی چیستاں سے کم نہیں۔ ''پادشاہ بیگم'' کا منصب ملنے کے ساتھ ہی اسے وسیع جاگیر عطا ہوئی جس کی آمدنی کی وہ مالک ومختار تھی۔ اس کے علاوہ اسے چار لاکھ روپے سال کا وظیفہ بھی ملتا تھا۔ وقتاً فوقتاً ہونے والی شاہی تقریبات میں اسے اپنے باپ کی طرف سے خطیر رقم تحفے کے طور پر بھی دی جاتی تھی۔ زیب النساء کے مزاج میں درویشی اور سادگی ابتداء سے تھی۔ ماں کی ناوقت موت، تخت نشینی کی جنگ کے نتیجے میں اپنے خونی رشتوں کی قید اور سفاکانہ قتل کے علاوہ ذکر، مراقبے اور صوفی تعلیمات نے دنیا کے بارے میں اس کے اندر ایک خاص انداز کی بے اعتنائی پیدا کر دی تھی، ذاتی زندگی کی تنہائی اور مرگِ محبت کے اندوہ نے بھی شاید اس کے حزن وملال میں اضافہ کیا۔ وہ اپنے خاندان کی دوسری شہزادیوں کی طرح قیمتی لباس، زیورات اور بے جا نمود ونمائش میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتی تھی۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ شاعری اور دیگر فنون لطیفہ کے بارے میں اس کے باپ کی ناپسندیدگی نے مغل دربار کو علمی اور ادبی اعتبار سے ویران اور بے شمار شاعروں، عالموں، مصوروں اور موسیقاروں کو بے آسرا کر دیا ہے۔ باپ کا یہ رویہ اس کے لیے دلی تکلیف کا سبب تھا۔ اس نے علمی اور ادبی محفلیں اپنے محل میں آراستہ کرنی شروع کیں۔ اورنگ زیب کو اپنی جنگی مہمات سے فرصت نہ تھی اور اس کا زیادہ وقت مختلف جنگی محاذوں پر گزرتا۔ اس صورتحال نے بھی شہزادی زیب النساء کے لیے علمی اور ادبی محفلوں کی میزبانی کو نسبتاً آسان بنا دیا۔ ایسا نہیں تھا کہ اورنگزیب جیسے بادشاہ کو اس کی خبر نہ تھی کہ اس کی بیٹی کے دربار میں کون لوگ بار پاتے ہیں۔ اس کا جاسوسی کا نظام اتنا وسیع تھا کہ امراء، عوام اور اس کے دشمن تو ایک طرف رہے، اس کی اولاد اور اس کے خاندان کے دوسرے افراد بھی اس دائرے سے باہر نہ تھے۔

ناصر علی سرہندی اور اس عہد کے کئی اہم شاعروں کے مرزا عبدالقادر بیدل جیسے جید عالم اور عظیم شاعر شہزادی کی ادبی اور شعری محفلوں میں شریک ہوتے رہے تھے۔ گارساں دتاسی اس سے تعلق خاطر رکھنے والوں کا تذکرہ کرتا ہے۔ اس کی شاعری پر حافظ اور میرابائی کے گہرے اثرات ملتے ہیں۔ یہ مگن لال اور West Brook Duncan تھے جنہوں نے سب سے پہلے

1912ء میں اس کا دیوان پہلے لاہور اور پھر لندن سے چھپوایا۔ وہ لکھتے ہیں کہ زیب النساء اس وقت کے دوسرے مسلمان عالموں سے مختلف ذہنی رویہ اور رجحان رکھتی تھی۔ ہندو اور زرتشی فلسفے پر اس کی گہری نظر تھی اور اس کی شاعری پر بھی ان کے اثرات تھے۔ ایچ رائے چوہدری' آر سی مجمودار اور کے کے دتا کی An Advanced History of Inida میں لکھا ہے کہ اس نے اپنے پردادا شہنشاہ اکبر کی پیروی میں ذاتی لائبریری تعمیر کروائی اور دارالترجمہ قائم کیا جس میں ہندی' سنسکرت اور عربی کی کلاسیکی کتابوں کو فارسی میں ترجمہ کیا جاتا۔ ہندوستان کے بہترین نقل نویس اس کے محل میں ملازم تھے جو اس کی پسندیدہ کتابوں کی نقلیں تیار کرتے۔

فرانسیسی مستشرق خاتون اینی کری نیکی لکھتی ہے کہ تصوف میں وہ فریدالدین عطار اور جلال الدین رومی کے مکتبۂ فکر سے تعلق رکھتی تھی۔ سیاست اور انسانوں کے بارے میں اپنے شہنشاہ باپ کے رویے اسے خوش نہ آتے تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ جب اورنگزیب نے دکن کی مسلمان ریاستوں کے خلاف فوج کشی کی تو زیب النساء دلی کے محل میں چاندی کی نازک جالی کے پیچھے بیٹھ کر اس دور کے اہم شعراء اور عالموں سے کلام کرتی رہی۔ ان کے درمیان شاعرانہ نوک جھونک ہوتی اور فی البدیہہ شعر کہے جاتے جس میں زیب النساء کو ملکہ حاصل تھا۔ وہ علم و ادب کی محفلوں میں اتنی مصروف رہتی اور ادب اور ثقافت کی اس حد تک سرپرستی کرتی کہ مذہبی حلقے اس پر انگشت نمائی کرتے' یہ علماء اورنگزیبی دربار کے راسخ العقیدہ امراء کو شہزادی کے خلاف بھڑکاتے۔ اس کی روشن فکری اورنگزیب کو بھی گراں گذرتی اور وہ اپنی بیٹی کو یہ راستہ اختیار کرنے پر سرزنش بھی کرتا۔

زیب النساء کے زوال کا سبب شہزادہ اکبر سلطان کی باپ سے بغاوت کو بیان کیا جاتا ہے۔ یہ درست ہے کہ زیب النساء اپنے بھائی شہزادہ اکبر سلطان سے بے پناہ محبت کرتی تھی۔ اس نے اپنی ماں دل رس بانو بیگم کی ناوقت موت کے بعد اکبر کی ماں بن کر اس کی پرورش کی تھی۔ اس کی تعلیم و تربیت میں بھی اس کا حصہ رہا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ جب شہزادہ اکبر نے اپنے باپ اورنگزیب کے خلاف بغاوت کی' اس دوران اس کی شہزادی زیب النساء سے خط و کتابت بھی رہی اور زیب النساء کے یہی خطوط اس کے زوال کا سبب بنے۔

اس دور کے مورخین نے یہ تاثر دیا ہے کہ یہ اکبر سلطان سے زیب النساء کی محض خواہرانہ محبت تھی جس کے سبب وہ باپ کے خلاف بغاوت کی سازش میں اس طور بھائی کی شریک جرم بن

گئی کہ اس نے اس بغاوت کی پیشگی اطلاع باپ کو نہیں دی۔ لیکن بات شاید اتنی سادہ نہیں۔ شہزادی زیب النساء نے تخت نشینی کی جنگ سے اپنے بھائی کی بغاوت کے وقت تک ایک طویل عرصہ گزارا تھا۔ اور اپنے باپ کی وہ بے مہریاں اور سفاکیاں دیکھی تھیں جو اس نے اپنے خونی رشتوں اور قریبی لوگوں کے ساتھ روا رکھیں۔ ان معاملات نے اسے اپنے چہیتے باپ سے کس قدر مایوس اور دلبرداشتہ کیا ہوگا اس کا اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں۔ یہ صرف بھائی سے محبت نہیں' باپ سے شکایات اور اختلافات کا برسوں پر پھیلا ہوا ایک طویل سلسلہ تھا جس کے سبب زیب النساء نے شہزادہ اکبر سلطان کو اس بغاوت سے روکنے کی کوشش نہیں کی ہوگی۔

بغاوت ناکام رہی' شہزادہ اکبر فرار ہو گیا اور زیب النساء کے وہ خطوط اورنگزیب عالمگیر کے سامنے پیش کیے گئے تو اورنگزیب کا سارا طیش اور انتقام شہزادی زیب النساء پر آسمانی بجلی کی طرح گرا اور اسے خاکستر کر گیا۔ زیب النساء کی تمام جائیداد ضبط ہوئی' اسے ملنے والا سالانہ وظیفہ جو چار لاکھ کی خطیر رقم پر مشتمل تھا بہ یک قلم موقوف ہوا۔ وہ جنوری کی یخ بستہ رات تھی جب حسن میں یکتا' فن میں باکمال اور شاعری میں بے مثال وہ عورت اپنے ہاتھی پر آخری بار سوار کرائی گئی اور سلیم گڑھ کے قلعے میں غروب ہو گئی اس وقت اس کی عمر 43 سال تھی۔ اسے اپنا ذاتی سامان تک ساتھ لے جانے کی اجازت نہیں ملی تھی۔ وہ یتیم خانے' لنگر خانے جو زیب النساء کی داد و دہش سے چلتے تھے سب بند ہوئے۔ منوچی نے لکھا ہے کہ سب سے زیادہ صدمہ ان سینکڑوں لوگوں کو ہوا جو ہر سال شہزادی کے خرچ پر عازم مکہ ہوتے اور حج کرتے تھے۔

وہ زیب النساء جس نے اپنی چہیتی کنیز میا بائی کے لیے لاہور میں ایک وسیع اور حسین باغ لگوایا تھا' اس کی آنکھیں سلیم گڑھ کی ریتیلی زمین میں سبزے کے لیے ترستی رہیں۔ لاہور کا یہ وہی باغ ہے جو آج ملیامیٹ ہو چکا ہے لیکن جس کی نشانی چوبرجی کی صورت میں آج بھی موجود ہے۔ اس باغ کے حوالے مگن لال' ایف ایس اعجاز الدین اور دوسروں کے یہاں ملتے ہیں۔ جادوناتھ سرکار کا کہنا ہے کہ اورنگزیب جیسے سخت گیر اور کٹر پنتھی شہنشاہ کی موجودگی میں شہزادی کی شخصیت کھلے ذہن کے شاعروں' عالموں اور دانشوروں کے لیے ایک ڈھال کی حیثیت رکھتی تھی' لیکن اب دلّی کا علمی اور ادبی حلقہ اپنی سرپرست سے محروم ہو چکا تھا۔

زیب النسا جو لال قلعہ کے پُرشکوہ ماحول میں ادبی محفلوں کی میزبان ہوتی تھی۔ قلعہ سلیم

گڑھ کی سنگلاخ دیواروں کے درمیان تنگ دستی اور تنہائی اس کی یار جانی ہوئی اور یہیں اس کی شاعری عشق، ہجر، الم اور رنج و ملال کے اس رنگ میں رنگی گئی جس نے اسے ایک اہم شاعرہ کی حیثیت دی۔ اس کا ''دیوان'' اس کے باپ اور بھائیوں کے لیے شرمندگی کا سبب تھا اور کیوں نہ ہوتا کہ اس میں ایک ہجر زدہ اور غمِ عشق میں گرفتار عورت کا فسانۂ غم تھا۔ اس کے اشعار میں ہندوؤں اور زرتشتیوں کے خیالات کا عکس تھا۔ قدیم فارس کے اساطیری حوالوں سے اس کی شاعری پُر ہے۔ اس کے اشعار میں شیعی تصورات کا عکس ہے، غرض ہر وہ عنصر موجود ہے جو اورنگزیب ایسے کٹر سنی العقیدہ شخص کے سخت گیر دورِ حکومت میں کفر کے زمرے میں آتا تھا۔ یہی سبب ہے کہ وہ اپنے عروج کے دور میں شہرت کی بلندیوں پر تھی، لیکن شہنشاہ وقت کی نگاہ سے گری تو کس کی مجال تھی کہ اس کی طرف نظر بھی کرتا۔ وہ اس طرح گم نامی کی دھند میں لپیٹی گئی کہ اس کے دیوان کے بارے میں بہ اصرار کہا جانے لگا کہ یہ کسی ایسے مرد کا دیوان ہے جس کا تخلص مخفی تھا، بھلا ایک مغل شہزادی، اورنگزیب عالمگیر جیسے سخت گیر شہنشاہ کی بیٹی، ہجر و وصال کی اور عشقیہ وارداتِ قلبی کی بات کس طرح کر سکتی ہے۔

عرش سے فرش پر آ جانے کے غم نے اسے جس قدر ملول و محزوں کیا اس کا عکس اس کے اشعار میں جھلکتا ہے۔ اس کے اندوہ کا اندازہ مجدد الف ثانی کے پوتے محمد نقش بندثانی کے ان متعدد مکتوبات سے کیا جا سکتا ہے جو انہوں نے شہزادی زیب النساء کے نام لکھے۔ ان خطوط کو ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان نے مرتب کیا۔ شہزادی کے نام ان کے چند غیر مطبوعہ خطوط ''نقوش'' میں شائع ہو چکے ہیں۔ یہ خطوط اپنے عہد کے اس جید بزرگ کے لکھے ہوئے ہیں جس کے باپ محمد معصوم سے اورنگزیب نے بیعت کی تھی۔

اورنگ زیب کے زیرِ عتاب آنے کے باوجود اس عہد کے خواص کے دل میں شہزادی زیب النساء کے درجات جس قدر بلند تھے اس کا اندازہ ان القابات سے لگایا جا سکتا ہے جو محمد نقش بندثانی نے اپنے خطوط میں لکھے ہیں۔ وہ اسے ''صاحبۂ عالم..... عالی تبارا..... رفیع القدرا..... عزیزۂ من..... فاطمۂ زماں.....'' کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ ان چند خطوط میں زیب النساء بیگم بادشاہ زادی دختر بادشاہ اورنگ زیب کے ان سوالات کا جواب دیا گیا ہے جو اس نے دربیانِ مدحِ درد و غم دریافت کیے تھے۔ اسی خط میں اسے لکھتے ہیں کہ ''عزیزہ من..... راہِ عقل جدا است و راہِ عشق و دیوانگی جدا.....''

اس کے دیوان پر اگر سرسری نگاہ ڈالی جائے تو اس میں ''اسیری، مرگ، قفس، اور کنج قفس'' کا ذکر فراوانی سے ملتا ہے۔ دکتور مہین دخت نے لکھا ہے کہ اس کے دیوان میں 40 مرتبہ سے زیادہ یوسف کا تذکرہ ہے۔ اسی طرح یعقوب اور گریۂ یعقوب کا بار بار ذکر آیا ہے۔ ''عشق'' کو اس نے کس کس طرح محسوس کیا اور لکھا اس کا اندازہ اس سے کیجئے کہ وہ ہمیں شانۂ عشق، افسانۂ عشق، حرم خانۂ عشق، پروانۂ عشق، آتش عشق، شراب عشق، درسِ عشق، زمزمۂ عشق، سوزِ عشق، شہیدِ عشق، حدیثِ عشق، خم خانۂ عشق، وادیٔ عشق، راہِ عشق، کشتۂ عشق، باغ عشق، لٹھتی نظر آتی ہے۔ اس کی زندگی کا ایک الم ناک باب دربار کے ایک امیر عاقل خان رازی سے متعلق ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ زیب النساء اور عاقل خان کی ایک دوسرے کے لیے وارفتگی کا معاملہ اورنگ زیب کے مخالفین کی اختراع ہے اور یہ محض بے سروپا بات ہے جس کا کوئی ثبوت نہیں۔ اس حوالے سے منشی محمد دین کی لکھی ہوئی 1897ء میں چھپنے والی ''حیات زیب النساء'' مولوی احمد دین کی ''دُرِ مکتوم'' غلام حضرت کی ''گلزار لطافت'' دھو یو مکرجی کا بنگلہ میں لکھا ہوا ناول سب ایک متشرع بادشاہ کی بیٹی پر غیروں کا باندھا ہوا افترا ہے جس میں مگن لال اور ڈنکن ویسٹ بروک اور اس قبیل کے دوسرے لوگوں کو لعنت ملامت کی گئی ہے۔ زیب النساء کی زندگی کے بارے میں منوچی، برنیر، سرکار اور دوسروں کا لکھا ہوا بھی غیر معتبر ٹھہرتا ہے۔

اس بحث میں پڑے بغیر کہ اورنگ زیب کے گھر میں پیدا ہونے والی بادشاہ زادی بھی انسانوں جیسے احساسات رکھ سکتی تھی، اسے بھی کسی سے عشق ہو سکتا تھا اور وہ بھی اظہار جذبات کر سکتی تھی، ہم تو اس ظلم پر احتجاج کرتے ہیں کہ اس سے شاعر ہونے کا اعزاز بھی چھین لیا گیا اور اس کا کلام کبھی کسی خراسانی اور کبھی رشت کے رہنے والے کسی ''مخفی'' کے نام سے منسوب کیا گیا۔ کبھی یہ لکھا گیا کہ ''مخفی'' بادشاہ زادی زیب النساء کے ایک ملازم کا تخلص تھا اور دیوان مخفی جس نے زیب النساء کی نسبت سے شہرت پائی وہ دراصل اس ملازم کا ہی کلام ہے۔

اردو دائرۃ المعارف اسلامیہ کی بارہویں جلد میں زیب النساء کے حالات زندگی لکھنے والے عبداللہ چغتائی (وادارہ) آخری سطروں میں تحریر کرتے ہیں کہ ''تذکرۂ خواتین'' میں بھی یہی ہے کہ وہ زیب النساء کی ملازمت میں تھا۔ ان بیانات سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ''مخفی'' تخلص کے شاعر ضرور تھے مگر زیب النساء کو ان سے کوئی تعلق نہیں تھا۔''

یہ ایک المناک بات ہے کہ ایرانی اس کی شاعری پر ناز کرتے ہیں اور اسے فخرِ ایران قرار دیتے ہیں۔ اسی طرح افغانیوں سے اس کا تذکرہ ہو تو وہ اسے رابعہ بلخی کے بعد دری کی سب سے بڑی شاعرہ کہتے ہیں' اس کا کلام سر پر رکھ کر پھرتے ہیں لیکن ہندوستان جہاں وہ پیدا ہوئی' جہاں وہ ''پادشاہ بیگم'' کہلائی' وہاں اس کے باپ کے عہد کے اکثر وقائع نگار اس کے شاعر ہونے سے ہی انکاری ہیں۔ وہ اس کی شاعرانہ محفلوں کا ذکر کرتے ہیں۔ اس کی کنیز ارادت فہم کے ہاتھوں اس کی بیاض حوض میں گر جانے کا ذکر ہر تذکرے میں موجود ہے۔ اس کے کہے ہوئے فی البدیہہ اشعار بھی لکھ دیتے ہیں۔ لیکن اردو میں شائع ہونے والے تذکروں میں بہ اصرار اور بہ تکرار یہی لکھا ہے کہ:

> ''عام طور پر مشہور ہے کہ وہ مخفی تخلص کرتی تھی اور دیوان مخفی جو چھپ کر شائع ہوا ہے' اسی کا ہے۔ لیکن یہ صحیح نہیں۔ کسی تاریخ یا تذکرے میں اس کے تخلص یا دیوان کا ذکر نہیں۔ مولوی آزاد ''ید بیضا'' میں لکھتے ہیں ''ایں دو بیت از نامِ اُو مسموع شدہ'' پھر دو شعر نقل کیے ہیں۔ دیوان ہوتا تو صرف دو شعر کا ذکر کیوں کرتے۔''

یوں اس بادشاہ زادی کی شاعری کا کام تمام کیا گیا اور کیوں نہ کیا جاتا کہ اورنگ زیب ایسے متشرع اور متدین بادشاہ کی بیٹی کے اس ''گناہ'' پر اسی طرح پردہ ڈالا جا سکتا تھا۔

اس کے کلام کا انگریزی ترجمہ بیسویں صدی کے آغاز میں لندن سے شائع ہوا۔ منشی نول کشور نے اسے 1929ء میں شائع کیا جس کا اردو میں دیباچہ عبدالباری آسی نے تحریر کیا۔ وہ ایرانی ماں کی بیٹی تھی اور یہ ایرانی ہیں جنہوں نے اس کے دیوان کو اہتمام کے ساتھ 2001ء میں تہران سے شائع کیا۔ دیوان مخفی کے خطی نسخے اور مطبوعہ نسخہ جات کی تفصیل ہمیں دکتور مہین دخت کے مرتب کردہ دیوان میں ملتی ہے۔ تہران' ایران سے 2001ء سن عیسوی میں شائع ہونے والے دیوان زیب النساء مخفی کو دکتور مہین دخت نے مرتب کیا ہے۔ اس دیوان میں پانچ سو چار غزلیں' چار ہزار پچیس اشعار' بارہ قصائد' دو ترجیع بند' چار ترکیب بند' ایک مسدس' ایک مخمس اور چند متفرق اشعار ہیں۔ دکتور مہین دخت صدیقیان نے دیوان مخفی کی ابتداء میں لکھا ہے کہ زیب النساء ایرانی ماں کی بیٹی تھی۔ اسی لیے ہم اسے ایرانی سمجھتے ہیں اور یہ سرزمین اس سے گہری وابستگی رکھتی ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ اس نے ملا سید اشرف مازندرانی سے فارسی و عربی اور شاعری کے رموز و نکات

کی تعلیم حاصل کی اور یہ بھی مازندرانی تھے جنہوں نے اسے نسخ، نستعلیق اور شکستہ خط سکھائے۔ ان کا کہنا ہے کہ اس نے شاعری کا باقاعدہ آغاز اکیس برس کی عمر میں کیا۔ اپنا تخلص ''مخفی'' رکھا تا کہ ایک شہزادی ہونے کے حوالے سے شعر کہنا جو ناپسندیدگی کے زمرے میں آتا تھا اس حوالے سے وہ خود کو پوشیدہ رکھ سکے اور لوگوں کی نگاہوں، طنز و طعنے اور کینے سے ''مخفی'' رہے۔

دربار عالمگیری سے وابستہ وقائع نگاروں میں سے عموماً یہی لکھتے رہے کہ اس نے کبھی کبھار شعر یقیناً کہے تھے لیکن ''دیوانِ مخفی'' اس کا نہیں کسی اور شاعر کا ہے۔ جس طرح خونِ ناحق نہیں چھپتا اسی طرح کسی ادیب یا شاعر کی تخلیقات کا خون بھی نہیں چھپتا۔ زیب النساء ختم ہوئی، دور عالمگیری ختم ہوا اور اس کے ساتھ ہی مغلوں کے زوال کی خونیں کہانی شروع ہوئی۔ منتشر اوراق پر لکھی ہوئی زیب النسا کی غزلیں اس کی کن جان نثار کنیزوں نے اکٹھی کیں اور سلیم گڑھ کے قلعے سے باہر پہنچائیں ہم نہیں جانتے۔ لیکن خون جگر سے لکھے ہوئے اس کے اشعار زندہ رہے، سانس لیتے رہے اور اس کے دیوان کے مخطوطے پیرس اور یورپ کی دوسری لائبریریوں میں موجود ہیں۔

اس کے شعر زندہ ہیں اور تین سو برس بعد بھی اس کی آواز ہم تک پہنچی ہے۔ شاعری میں اس کے استاد ملا محمد سعید کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ وہ ایک آزاد عورت تھی اور درباری سیاست سے کنارہ کش تھی۔ دکتور مہین دُخت نے بھی شہزادہ اکبر کی بغاوت کے حوالے سے اس پر جو قہر شاہی نازل ہوا اس کا تذکرہ بھی کیا ہے۔

تین سو برس بعد زیب النساء مخفی کو یہ داد اس کی ماں دل رس بانو بیگم کے وطن سے ملی کہ:

''ایں زن ہندی بہ پارسی شعر گفتہ بود

آفریں برجگرم باد کہ درکشور ہند

سکۂ نقدِ سخن، رائج ایران زدہ ام

وبرائے من ایرانی غرور آفرین بود یاد آوری آں ہمہ سرزمین ہا کہ مردمش بہ زبانِ ما تکلم می کردہ اند۔''

اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں

دربزم خیالت ولم از ساغرِ حیرت

نوشید شراب کہ زگرمی جگرم سوخت

دخترِ شاہیم لیکن روبہ فقر آوردہ ایم
زیب وزینت سوختیم ونام (ما) زیب النسا است

زاہدِ خلوت نشیں تا طرۂ زلفِ تُو دید
رشتۂ تسبیح را زنارِ ہندو کرہ است

مامست شرابِ جامِ عشقیم
بدمستیِ ما نہ از شراب است

خواہ سوئے کعبہ باشد و خواہے سوئے دیر
طاقِ محرابِ گرفتاراں خمِ ابروئے توست

گشت سامانِ زلیخا صرف یک سودائے عشق
تاجرانِ عشق را سودو زیاں دیگر است

سلیم گڑھ کے زنداں میں زیب النساء کی زندگی کے بیس برس گزارے اور وہ کبھی اپنے باپ سے معافی کی طلبگار نہیں ہوئی اور نہ اس سے کسی طرح کی مہربانی کی درخواست کی۔ 1702ء میں جب وہ دنیا سے رخصت ہوئی تو متشرع اور متدین شہنشاہ کو اطلاع بھیجی گئی تب اسے یاد آیا کہ اس کی ایک بیٹی بھی تھی جو 63 برس کی ہو چکی تھی اور جس کی نظر بندی پر 20 برس گزر چکے تھے۔ اس نے زیب النساء کے لیے دعائے مغفرت کی' اس کے نام پر خیرات کا حکم ہو۔ اینی کری نیکی نے لکھا ہے کہ شاعروں نے اس کا مرثیہ نہیں لکھا' وہ جانتے تھے کہ شہنشاہ کے قیدیوں کی موت پر مرثیہ لکھنا جرم ہے۔ آپ ہی بتایئے کہ پھر تاریخ اسے کیوں یاد رکھتی؟

(جاری ہے)

☆☆☆

خلافت تحریک کے تضادات/تاریخ کے المیے

حمزہ علوی
ترجمہ: ڈاکٹر ریاض احمد شیخ

۱۹۱۹ سے ۱۹۲۴ تک چلنے والی "خلافت" تحریک کی اب تک واحد اور منفرد بات یہ ہے کہ اسلامی نظریہ سازوں، ہندوستانی قوم پرستوں، کمیونسٹوں اور ان کے ساتھ ساتھ مغربی دانشوروں نے ایک ساتھ مل کر اس تحریک کو بڑھا چڑھا (Glorified) کر کے ہندوستانی مسلمانوں کی سامراج مخالف (Anti-Colonial) تحریک سے تعبیر کیا ہے جو کہ حکومت کی مسلمانوں کے انتہائی قابل احترام خلیفہ کے خلاف دشمنانہ رویے کی وجہ سے شروع کی گئی (1)۔ اس تحریک کی حقیقی وجوہات کو جاننے کی بڑی محدود کوشش کی گئی ہے جبکہ جذباتی انداز میں باتیں صرف ظاہری حقائق کو دیکھ کر ہی کی جاتی رہی ہیں۔ اس تحریک کا بغور مطالعہ کرنے کے نتیجے میں اس تحریک میں موجود کئی تضادات اور تکرار (Paradoxes) جواب تک جذباتی نعروں کی وجہ سے پوشیدہ رہے ہیں، وہ سامنے آتے ہیں۔ اس تحریک کی سب سے بڑی "کامیابی" (Achievement) جو کہ اب تک چلتی آ رہی ہے وہ بات یہ کہی جا سکتی ہے کہ اسکے نتیجے میں مسلمان علماء (Clergy) کو سیاست میں باقاعدہ کردار ادا کرنے کا موقع مل گیا اور انھوں نے جمعیت علمائے ہند کی صورت میں ایک سیاسی تنظیم بنالی جس کے ذریعے علماء نے سیاسی و نظریاتی بنیادوں پر سیاست میں اہم کردار ادا کرنا شروع کیا۔ اس سے قبل مسلمانان ہند کی تاریخ میں علماء کو سیاسی زندگی میں اس قدر اہم اور مرکزی کردار ادا کرنے کا موقع پہلے کبھی نہ ملا تھا۔ راقم کے خیال میں اس تحریک کے نتیجے میں ہندوستان اور پاکستان کے مسلمانوں کی سوچ اور مسلمان سیاست میں رجعت پسندی کے خیالات

اوراس کے اثرات اب بھی باقی ہیں۔اس وجہ سے ضروری ہے کہ تحریک خلافت کا ایک بار دوبارہ جائزہ لیا جائے اوراس کی اہمیت وافادیت کو دوبارہ سمجھنے کی کوشش کی جائے۔

خلافتیوں کے دعوے

ہندوستان کے خلافتیوں کے خلافت کے حق میں دعوے مندرجہ ذیل وجوہات کی بنیاد پر استوار ہوئے۔

۱۔عثمانیہ خلافت مسلمانوں کی " عالمگیر خلافت " Universal Caliphate تھی جس کی دنیا کے کسی بھی کونے میں آباد ہر مسلمان پر پیروی کرنا لازم تھا۔

۲۔عیسائی دنیا اور عالم اسلام کے درمیان جنگ جاری تھی اور عیسائیوں نے خلافت عثمانیہ کے یورپی علاقوں پر قبضہ کرلیا تھا اور ہندوستاں کے مسلمان پر لازم تھا کہ وہ اس کے قبضے پر ماتم کریں۔

۳۔برطانیہ عثمانی خلیفہ کا سب سے بڑا دشمن تھا اور اس نے جنگ عظیم اول کے بعد خلیفہ کو استنبول میں محصور کرلیا تھا۔اسلئے انکا دعوی تھا کہ خلیفہ کو اس کی ذاتی حیثیت اور اس کے رتبے سمیت تحفظ فراہم کیا جائے اور اس کے ساتھ ہی خلیفہ کے رتبے کی خودمختاری کو بھی بچایا جائے اور عثمانیہ سلطنت کے تمام عرب علاقوں اور مسلمانوں کے مقامات مقدسہ پر خلیفہ کے اختیار کو برقرار رکھا جائے اوران کے تقدس اوراحترام کو بحال رکھا جائے۔

اُس وقت کے حقائق کا جائزہ یہ ثابت کرتا ہے کہ خلافتیوں کے یہ تمام دعوے مشکوک تھے۔ہم اس مختصر مقالے میں ان معاملات کا اختصاراً کے ساتھ جائزہ لینے کی کوشش کرینگے۔

سلطنت عثمانیہ کی ابتداء

عثمانوی سلطانوں کا خلیفہ کا رتبہ حاصل کرنا ایک متنازعہ معاملہ رہا ہے۔موجودہ جدید دور میں

جب عثمانی سلطانوں نے اپنے لئے خلیفہ کا لقب چنا تو اس کے پس پشت انکا دعوی یہ تھا کہ "خلافت" قاہرہ کے عباسی خاندان کے ایک فرد المتوکل نے عثمانی سلطان سلیم اوّل کو منتقل کی تھی۔ المتوکل اس وقت مصر میں مملوک حکمران بیبارز Baybars کے قیدی کی حیثیت میں زندگی گزار رہا تھا جسے سلیم نے ۱۵۱۷ میں شکست دی تھی۔ بیبارز جو کہ مملوک حکمرانوں میں سب سے منفرد حیثیت کا مالک تھا درحقیقت ایک ترک غلام تھا۔ بیبارز نے المتوکل کے والد کو جو کہ آخری عباسی خلیفہ کے چچا تھے بڑی شان و شوکت کے ساتھ قاہرہ میں مسند پر بٹھایا اسے محققوں نے بوگس خلیفہ (Pseudo Caliph) نمائشی خلیفہ کے لقب سے تعبیر کیا ہے (۲)۔ جسکے پاس بیشک نام اور لقب تو تھا لیکن بغیر کسی اختیار کے۔ اس نمائشی خلیفہ کو مسند پر بٹھانے کے پس پشت بیبارز کے اصلی مقاصد میں یہ بات شامل تھی کہ اسکے ذریعے وہ اپنے اقتدار کے لئے مسلمانوں کی نظروں میں جائز مقام حاصل کرنے کا خواہشمند تھا (۳)۔ المتوکل نے اپنے والد کے انتقال کے بعد اپنے مرحوم والد کا کردار سنبھال لیا۔ اس کا یہ دعویٰ تھا کہ وہ آخری عباسی خلیفہ کا قانونی وارث ہے جبکہ درحقیقت وہ ایک ایسا شخص تھا جس کے پاس نہ کوئی ملک تھا نہ ہی کوئی اختیار۔ اس کے پاس بس علامتی طور پر ایک تعلق تھا جو کہ اس کے عباسی خانوادے سے تعلق اور نسبت کی علامت تھا اور یہ علامت ہی بیبرس کے لئے بہت سودمند تھی۔ قاہرہ کی فتح کے بعد عثمانی سلطان سلیم شکست خوردہ مملوک حکمران بیبارز کے جبری مہمان یعنی بے یارومددگار المتوکل کو اپنے ساتھ استنبول لے آیا تاکہ مملوکوں کو انکے آئندہ کے کسی بھی ممکنہ خلافت کے قانونی دعوے سے محروم کر سکے۔ تاریخ دان "خلافت" کے عمل کی المتوکل سے سلیم کے نام منتقلی کو بڑے شکوک وشبہات سے دیکھتے ہیں (۴)۔ یہ کہا جاتا ہے کہ المتوکل اس حیثیت میں ہی نہ تھا کہ وہ خلافت کسی اور کو منتقل کرتا کیونکہ وہ نہ تو خود کسی ملک پر حکمرانی کر رہا تھا اور نہ ہی اسکے پاس کوئی قوت تھی۔ اس بات کا سب سے اہم ثبوت یہ ہے کہ سلیم اور اس کے بعد اس کے جانشینوں نے آئندہ تقریباً ساڑھے تین صدیوں تک اپنے آپ کو کبھی بھی خلیفہ نہیں کہلوایا۔ اس تمام عرصے میں عثمانی خلافت کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔ اسکے بجائے عثمانی سلطانوں نے "غازی" کا لقب استعمال کرنے میں فخر محسوس کیا۔

قرون وسطی کے مسلمان حکمرانوں کے لئے یہ قرینہ عام ہو گیا تھا کہ وہ اپنے آپ کو خلیفہ کہلوائیں۔ یہ دیگر القابات جیسا ایک لقب تھا جنھیں وہ اپنی شان وشوکت بڑھانے کے لئے

استعمال کرتے تھے۔ ترکی میں بھی اسی قسم کی روایت نے جنم لیا اور کئی دہائیوں تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ خلیفہ کا لقب بھی ان دیگر کئی القابات میں سے ایک تھا جو کہ عثمانی سلطانوں نے اپنے لئے منتخب کئے۔ لیکن سرکاری اور باقاعدہ طور پر خلیفہ کا لقب عثمانیوں نے ۱۷۷۴ تک استعمال نہیں کیا یعنی سلطان سلیم کی مملوکوں پر مشہور کامیابی کے ۳۰۰ سال بعد تک بھی یہ لقب استعمال نہیں ہوا۔ اس سال (یعنی ۱۷۷۴) عثمانی سلطانوں کے خلیفہ کا لقب استعمال کرنے کی ابتداء ایک اتفاقی واقعہ تھا۔ روسیوں نے اپنی فتح کے بعد جب مذاکرات اور معاہدہ کچ کرتیزی (Treaty of Kucuk Kaynar) کے لئے بات چیت شروع کی تو انھوں نے اپنی ملکہ کو کیتھرین اعظم (Catherene the Great) کے لقب سے پکارا۔ جس کا سبب اس کا (Orthodox) قدامت پسند چرچ کے سربراہ ہونے کا دعویٰ تھا۔ اس دعوے کا مطلب یہ تھا کہ روس کا حکمران تمام آرتھوڈکس عیسائیوں کے سربراہ ہونے کی وجہ سے عثمانی سلطنت کے عیسائیوں کی وفاداری کا حق دار بن گیا تھا۔ سلطنت عثمانیہ کی مذاکراتی ٹیم کے ایک رکن نے اپنی کم رتبگی کی جھجھک مٹانے اور عیسائی ریاست سے مقابلہ کرنے کے لئے اپنے "مالک سلطان" کو بھی تمام مسلمانوں کا حکمران ثابت کرنے کے لئے "خلیفہ" کا لقب استعمال کیا جبکا مطلب یہ تھا کہ روسی سلطنت میں رہنے والے مسلمانوں کی وفاداریاں بھی مسلمان خلیفہ کے ساتھ تھیں۔ اس لقب کے اختیار کرنے کے پس پشت اسکے علاوہ کوئی اور مقصد نہ تھا۔

اس واقعہ کے بعد اور غیر رسمی طور پر خلیفہ کا لقب استعمال کرنے کے باوجود بھی عثمانیوں نے کبھی بھی اپنے باقاعدہ خلیفہ ہونے اور تمام مسلمانوں کے مذہبی سربراہ ہونے کا دعوی نہ کیا۔ یہ تبدیلی بہت عرصے بعد آئی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ عثمانیوں نے خلافت کا دعویٰ برطانیہ کی حوصلہ افزائی کے بعد اپنانے کا فیصلہ کیا کیونکہ عثمانی حکمران برطانیہ کے بڑے قریبی اتحادی تھے اور برطانیہ ان کا سرپرست تھا۔ برطانیہ کی منصوبہ بندی یہ تھی کہ وہ اپنے آپ کو تمام مسلمانان عالم کے مذہبی سربراہ یعنی خلیفہ کا اتحادی اور دوست ثابت کر کے ہندوستانی مسلمانوں میں مقبولیت اور ان کی ہمدردیاں حاصل کر سکتا تھا۔ برنارڈ لوئس لکھتا ہے کہ برطانیہ کی حوصلہ افزائی کے باعث پہلی مرتبہ سلطان عبدالعزیز (۷۶-۱۸۶۱) کے عہد میں عثمانی سلطانوں نے یہ دعویٰ کیا کہ وہ عثمانی سلطنت کے ہی نہیں بلکہ تمام عالم اسلام کے بھی خلیفہ ہیں (۵)۔

عثمانی خلفاء کی قانونی حیثیت

یہ انیسویں صدی کے آخر کی بات ہے کہ جب عثمانی سلطانوں نے عالمگیری خلافت (Universal Caliphate) کے دعوے دار ہونے کا فیصلہ کیا۔ اب انہیں اپنے اس دعوے کو دنیا کی نظر میں جائز ثابت کرنے کے لیے کوششیں کرنا تھیں۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ترکوں نے اردو صحافت کے استعمال کا فیصلہ کیا جس پر ترکوں کا بڑا اثر ونفوذ تھا۔ اسکے ذریعے مافوق العقل (Mythical) کہانیاں گھڑی گئیں اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ ۱۵۱۷ میں المتوکل نے خلافت سلطان سلیم کو منتقل کردی تھی۔ خلافت کے دعوے کو قابل قبول بنانے کے لئے ضروری تھا کہ عثمانی خلیفہ اپنی خلافت کے دعوے کو گذشتہ تاریخ سے منسلک کریں۔ انھیں اندازہ تھا کہ اگر وہ کسی بھی صورت یہ ثابت کردیں کہ خلافت انہیں خاندان عبّاس کے کسی امین (Custodian)، چاہے وہ جلاوطن یا قیدی ہی کیوں نہ ہوں، نے عثمانی سلطان کو منتقل کی تھی تو اس صورت میں وہ اپنے دعوے کو کافی حد تک مضبوط بنا سکتے تھے پھر اسے کسی مزاحمت (Challenge) کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔ اس طرح عثمانی حکمران متوکل کی قبر سے اپنے لئے خلیفہ ہونے کا ثبوت ڈھونڈنا چاہتے تھے۔

ہندوستان کے مسلمان عثمانی خلیفہ کے خلافت کے دعوے کو جائز تسلیم کرنے کے مسئلے پر دو گروہوں میں تقسیم ہو چکے تھے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ دونوں گروہوں نے تمام تر اختلافات کے باوجود خلافت کی المتوکل سے سلطان سلیم کی طرف منتقلی کی خود ساختہ کہانی کی حقیقت جاننے کی کوئی کوشش نہ کی۔ بریلوی روایات کے پیروکار مسلمانوں نے عثمانی خلافت کی المتوکل سے سلطان سلیم کو منتقلی کی فضول کہانی کی صحت پر سوال اٹھانے کے بجائے ایک بنیادی اصول کی بنیاد پر مسترد کردیا۔ اردو صحافت کے ترک خلفاء کے زیر اثر ہونے اور اردو صحافت میں خلافت کے بھرپور دعووں اور حمایت کے باوجود بریلویوں کے اعتراضات بڑی بنیادی نوعیت کے تھے۔ انکا خیال یہ تھا کہ خلافت کا جائز وارث صرف قریش قبیلے سے تعلق رکھنے والا شخص ہی ہوسکتا تھا۔ عثمانی کسی بھی طرح قریش سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔ اس لئے وہ خلافت کی سب سے بنیادی اور اہم شرط پر بھی پورا نہیں اترتے تھے۔ بریلویوں کے اس دعوے کے پس پشت مضبوط دلائل اور اسلامی تاریخ کی

روایات موجود تھیں۔ نامور مسلمان فقہاء بشمول امام غزالی اور الماوردی اس بات پر پہلے ہی زور دے چکے ہیں کہ فقط قریش خاندان کا شخص ہی خلیفہ بننے کا اہل ہوسکتا تھا(۶)۔ بریلویوں کی طرف سے عثمانیوں کے دعوے کو مسترد کئے جانے کے بعد مولانا عبدالباری فرنگی محل نے فروری ۱۹۱۹ میں مسلمانان ہند میں ترک خلافت کو جائز قرار دینے کے لئے ایک فتویٰ جاری کیا جس میں یہ بات کہی گئی کہ خلیفہ ہونے کے لئے قریش النسل ہونا لازم نہیں۔ مولانا باری کے اس فتوی کے مدمقابل بڑی قدآور اسلامی شخصیات امام غزالی اور الماوردی کی تعلیمات تھیں اس لئے فرنگی محل کے اس فتوے کو نا صرف بریلویوں بلکہ بااثر دیوبندی علماء نے بھی مسترد کردیا۔ مینو(Minault) نے یہ بات کہی ہے کہ اس وقت کے کئی علماء نے مولانا فرنگی محل کے اس فتوے پر دستخط کرنے سے انکار کردیا۔ مینو کے مطابق فرنگی محل کے فتوے سے دیوبند، پنجاب اور بنگال کے کئی نامور علماء نے اختلاف کیا(۷)

خلافت کے مسئلے پر بریلوی مسلمانوں کے اس اصولی موقف کو اکثر اسکالرز نے مکمل طور پر نظر انداز کردیا ہے۔ بریلویوں کا اثر صرف شہروں تک محدود نہ تھا بلکہ انکے پیروکار بڑی بھاری تعداد میں دیہی علاقوں میں بھی آباد تھے۔ بریلوی عقائد اور دیوبندی روایات (جن کی تعلیم دیوبند دارالعلوم سے کافی پرانی ہے) کے درمیان اختلافات کافی گہرے ہیں۔ بریلوی عقائد کے مطابق خدا اور تمام انسانوں کے درمیان تعلق اور وسیلہ پاکدامن انسان یعنی پیر ہوتے ہیں اور اسکا اہم ثبوت پیغمبر اسلام کا عام انسان اور اللہ کے درمیان وسیلہ بننا ہے(۸)۔ یہ باتیں توہم پرستی کے باوجود ہندوستانی اسلام کی میانہ روی کی روایت کی علامت ہیں۔ اسکالرز اور محققین نے جنوبی ایشیائی اسلام کی بریلوی روایات کو مکمل طور پر نظر انداز کیا ہے۔ سینیال (Sanyal) کی بنیادی نوعیت کی تحقیق اس میدان میں بہرحال ایک منفرد اور ابتدائی نوعیت کی تحقیق ہے(۹)۔

خلیفہ کے تصور کا بلا جانچ جائزہ

ابوالکلام آزاد جو کہ ہندوستانی خلافت تحریک کے تشکیل کاروں میں شامل تھے۔ انھوں نے اسلام کے روایتی اور بنیادی اصولوں سے دور ہٹتے ہوئے اس تحریک کی حمایت کچھ ان الفاظ میں کی۔

"یہ شریعت کا قانون ہے کہ ہر دور میں مسلمانوں کا ایک خلیفہ اور امام ہونا

چاہیے۔ خلیفہ سے مراد ایک ایسا بااختیار اور آزاد مسلمان بادشاہ یا حکمران ہے جو کہ حکومت بھی رکھتا ہو اور اسکے ساتھ ساتھ ملک کا حکمران بھی ہو اور وہ مکمل اختیار کے ساتھ اپنی ریاستی حدود میں بسنے والے مسلمانوں اور ان کی جغرافیائی حدود کی حفاظت بھی کر سکتا ہو اور وہ شریعت کے قوانین کا اعلان کرنے اور ان کو نافذ کرنے کا اختیار بھی رکھتا ہو اور اتنا طاقتور ہو کہ وہ اسلام کے دشمن کا مقابلہ کرنے کی بھی صلاحیت رکھتا ہو" (10)

ہندوستان کے خلافتیوں کے خیال میں ترکی کے سلطان مسلمانوں کے جائز خلیفہ تھے اور مسلمانوں کے لئے یہ لازم تھا کہ وہ عثمانی خلیفہ سے اپنی وفاداری ثابت کریں۔

یہ بڑی حیرت انگیز بات ہے کہ ہندوستان کی خلافت تحریک پر ضخیم مواد میں جو کہ آزاد اور دیگر کئی افراد نے فراہم کیا ہے، اس تحریک کے صرف مذہبی پہلو ہی کو زیادہ اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ زیادہ تکلیف دہ بات یہ ہے کہ آزاد اور دیگر لوگوں کی باتوں پر تنقید کئے بناء ان پر مکمل یقین کر لیا گیا ہے۔ اس لئے خلافت تحریک کا حقیقی جائزہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ اس بنیادی سوال کو زیر غور نہ لایا جائے جو کہ اس تحریک کا نقطہ آغاز تھا۔

اگر اس مسئلے پر غور شروع کیا جائے تو بنیادی تضاد اس دعوے پر اٹھتا ہے جہاں عثمانیوں نے خلافت کی المتوکل سے سلیم کی طرف منتقلی کے دعوے کو اٹھایا ہے اور جسے ہندوستانی خلافتیوں نے بغیر سوال کئے عثمانیوں کے لئے جائز اختیار (Charter) کے طور پر تسلیم کر لیا ہے اور آزاد نے خلافت کی اس منتقلی کے عمل کو ہر صورت میں جائز مان لیا ہے۔ آزاد نے سلطنت عثمانیہ کے خلافت کے دعوے کی حمایت میں جن شرائط کو تسلیم کیا ہے وہ ابتداء ہی سے ناقص تھیں۔ آزاد نے بذات خود جو شرائط عائد کیں ہیں اسکے مطابق بھی المتوکل کا عباسی خلافت کا جائز امین (Custodian) ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ وہ نہ تو مسلمان بادشاہ تھا اور نہ ہی کسی ریاست کا حکمران تھا اور نہ ہی وہ ایک آزاد، خودمختار اور طاقتور شخص تھا۔ وہ تو مملوک حکمران بیبارز کا ایک قیدی تھا۔ اس لئے ان حالات میں اس کی طرف سے شرعی قوانین کے نفاذ کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور نہ ہی المتوکل اس حیثیت میں تھا کہ وہ خلافت کو عثمانیوں کو منتقل کر سکے کیونکہ وہ بذات خود ہی ایک جائز خلیفہ نہ تھا۔ اس کے پاس دینے کو کوئی چیز نہ تھی۔ عثمانی خلیفہ کی طرف سے خلافت کے دعوے پر یہ تنقید بالکل الگ اور

اس اعتراض سے جدا تھی جس کا اظہار بریلویوں نے کیا تھا۔ آزاد کا خلافت کی حمایت کا دعویٰ تضادات سے بھرپور تھا۔

لفظ 'خلیفہ' کے معنی

یہ بڑا ہی اہم ہے کہ ہم ابتداء ہی میں لفظ "خلیفہ" کے معنی و مفہوم سمجھ لیں اور خاص طور پر وہ طریقہ کار جس کے تحت یہ لفظ بعد ازاں لسانی طور (Linguistically transformed) پر تبدیل ہوا اور خاص طور پر جب اموی بادشاہوں نے فوج کی طاقت کے بل بوتے پر اقتدار پر قابض ہونے کے بعد اپنی حکمرانی کو جائز ثابت کرنے کے لئے لفظ "خلیفہ" کو استعمال کیا۔ لفظ "خلیفہ" کو عربی کے لفظ "خَلفَ" سے لیا گیا ہے جس کے معنی "پیروی کرنا" یا "بعد میں آنا" کے ہیں۔ اس کا مطلب جانشین (Successor) بالترتیب ہے نا کہ موروثی جائیداد یا دیگر خصوصیات کا وارث۔ جب پیغمبر محمد ﷺ کے انتقال کے بعد حضرت ابوبکر ان کے جانشین مقرر ہوئے تو وہ مستقل طور پر خلیفۃ الرسول اللہ یا جانشین پیغمبر رسول اللہ کہلاتے رہتے۔ اپنے حقیقی معنی میں جانشینی کے لئے استعمال کیا گیا لفظ "خلیفہ" کسی عہدے، رتبے اور حق حکمرانی یا اسی قسم کے کسی اختیار کو ظاہر نہیں کرتا جس طرح کہ بالکل مختلف معنوں میں یہ بعد ازاں استعمال ہوا۔ اس لحاظ سے لفظ "خلیفہ" بطور "جانشین" کے کسی مخصوص شخص پہلے سے موجود (Preceder) کے مخصوص جانشین (successor) کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اسی لئے حضرت ابوبکر صرف خلیفہ تھے اپنے قبل ازیں یعنی رسول اللہ کے۔ یعنی مخصوص پیغمبر کے مخصوص خلیفہ۔

اس تناظر میں جب حضرت عمر مسلمان امت کے سربراہ مقرر ہوئے یعنی حضرت ابوبکر کے جانشین مقرر ہوئے تو اسی لحاظ سے انھیں خلیفہ الخلیفۃ الرسول اللہ یعنی جانشین براہ جانشین پیغمبر خدا (Successor to the Successor to the messenger of Allah) کہا جانا چاہئے تھا اس لئے ہر نئے جانشین کے ساتھ لفظ "خلیفہ ال۔۔۔۔۔۔۔۔" پچھلے لقب کے ساتھ اضافی طور پر لگایا جانا چاہیے تھا۔ جو کہ بڑا ہی مضحکہ خیز اور بے عقلی بدمزہ ہوتا۔ اس لیے لفظ خلیفہ کا استعمال ان تمام افراد کے لئے جو کہ حضرت ابوبکر کے بعد آئے ان کے لئے ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسی لئے حضرت ابوبکر کے تمام جانشینوں بشمول حضرت عمر، حضرت عثمان اور حضرت علی جو کہ تینوں

امت کے منتخب سربراہان تھے انھوں نے اپنے لئے "امیر المومنین" یعنی مومنوں کے سربراہ کا لقب استعمال کیا۔

جب امیہ سلطنت دمشق میں قائم کی گئی تو اس وقت اس کی قانونی حیثیت پر بحث اور لڑائی شروع ہوگئی۔ گذشتہ روایتوں میں جہاں امت کی سربراہی چناؤ کے ذریعے طے کی جاتی تھی۔ امیہ سلطنت کے قیام کے بعد تخت پر "قبضہ" طاقت کے زور پر یعنی فوج کے استعمال کے ذریعے حاصل کیا جانے لگا۔ اسی وجہ سے مولانا مودودی نے اموی سلطنت کے اقتدار سنبھالنے کے عمل کو اسلام کے خلاف ردانقلاب (Counter Revolution against Islam) یا انقلاب معکوس کے نام سے تعبیر کیا یعنی ایسا نظام جو کہ اسلام کے آنے سے قبل کے دورِ جاہلیہ کی طرف واپسی کا سفر تھا۔ اموی حکمران جو کہ طاقت کے زور پر بادشاہ بن گئے تھے انھیں اپنے اقتدار کو جائز ثابت کرنے کے لئے کسی علامت کی ضرورت تھی۔ اس مقصد کے لئے انھوں نے لفظ خلیفہ کا "انتخاب" کیا۔ اس طرح انھوں نے اپنے نام کے ساتھ پیغمبر محمد ﷺ کے جانشین حضرت ابوبکر کے لقب لگا کر اس بات کی امید باندھی کہ یہ لفظ ان کی حکمرانی کو جائز قرار دلوا سکتا ہے جبکہ انھوں نے یہ قدم اٹھا کر اس لفظ کے معنی ہی تبدیل کر دیئے تھے۔ اب لفظ خلیفہ صرف مخصوص پیش رو کے جانشین کے طور پر استعمال نہیں ہو رہا تھا بلکہ اب اس کا استعمال ہر حکمران یا بادشاہ کے لئے ہونے لگا۔

گو ایک نیا لفظ تلاش کرلیا گیا تھا، حالانکہ یہ لفظ اب بھی اپنی ادائیگی (Pronounciation) اور حروف تہجی (Spelling) میں بالکل اپنے اصل لفظ "خلیفہ" کی طرح استعمال ہو رہا تھا جس کے معنی "جانشین" کے ہی تھے لیکن اب اس کا مفہوم تبدیل ہوگیا جس کا اصل لفظ سے کوئی تعلق نہ تھا۔ نئے معنوں میں اس لفظ کے استعمال کا ایک نیا تصور (Neo-Logism) سامنے آیا تھا جس کا اصل لفظ "خلیفہ" (یعنی جانشین) سے کوئی لسانی (Etymological) یا (Semaritical) تعلق نہ تھا۔ اس نئے لفظ کا مطلب بادشاہ یا مطلق العنان حکمران تھا۔ سرسید احمد خان نے اس پر اپنا تبصرہ دیتے ہوئے لکھا:

> "لفظ خلیفہ کو حضرت عمر نے اس وقت چھوڑ دیا تھا جب وہ حضرت ابوبکرؓ کے جانشین مقرر ہوئے تھے۔ اسکے بدلے انھوں نے امیر المومنین کے لقب کو استعمال کرنا شروع کیا۔ یہ لقب حضرت علی بلکہ انکے بعد بھی کچھ عرصے

تک استعمال ہوتا رہا.....اسکے بعد اور پھر حضرت امام حسین کے بعد امیہ
خاندان کے افراد جنھوں نے طاقت کے بل بوتے پر اقتدار پر قبضہ کرلیا
تھا؟انھوں نے اپنے آپ کو خلیفہ کہلانا شروع کردیا (۱۴) کیونکہ ان کا
خیال تھا کہ خلیفہ کا لقب امیر المومنین کے بالمقابل زیادہ "مقدس" تھا (۱۵)

لفظ خلیفہ جسے اموی بادشاہوں نے بڑے طریقے سے اپنی مطلق العنان حکمرانی کو جائز قرار دینے کے لئے استعمال کیا یہ لفظ ان کے لئے بے معنی رہتا اور ان کو مطلوبہ قوت فراہم نہ کرتا اگر اس لفظ کو پیغمبر اسلام کے چار جانشینوں سے منسلک نہ کیا جاتا۔ لیکن عمومی تاثر یہی رہتا تھا کہ امیوی حکمران اس درجے پر فائز نہ تھے جہاں کہ ابتدائی چار خلفاء تھے اس لئے حضرت ابوبکرؓ اور ان کے تین جانشینوں کے القابات کو تبدیل کر کے انہیں "خلفاء راشدین" (۱۶) (Highly Guided Caliphs) بنا دیا گیا۔ اس سے یہ بات واضح تھی کہ اگر مذہبی طور پر ابتدائی چار خلفاء کو کوئی مخصوص مذہبی مقام حاصل تھا تو اس کا امیہ دور میں آنے والے باقی خلفاء پر مکمل طور پر اطلاق نہیں ہوتا تھا۔

امیہ دور تک لفظ "خلیفہ" کا کسی مخصوص مذہبی معنوں میں استعمال شروع نہ ہوا تھا۔ ان کے لئے یہ لفظ اب تک صرف اپنے اختصار کو قانونی شکل دینے کی ایک صورت تھی بلکہ اسی طرح جیسا کہ قرون وسطی کے یورپ میں بادشاہ اپنے اقتدار کے لئے "الہامی حقوق" Divine rights (of the Kings) کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ یہ کچھ صدیوں بعد ممکن ہوا کہ جب لقب "خلیفہ" کی مذہبی اہمیت کو سمجھا گیا اور پھر اس کی بنیاد پر عباسی خلافت کے آخری دنوں میں جبکہ خلافت تنزل اور زوال کا شکار تھی اور جب خلیفہ عسکری کمانڈروں یا علاقائی شہزادوں کے آگے کٹھ پتلی بن کر رہ گئے تھے، اس وقت اقتدار پر ان حقیقی قابض لوگوں نے ایک ایسے نظریہ کی تخلیق کرنے کا سوچا جس کے تحت خلیفہ کو بحیثیت سیکولر حکمران کے ریاستی قوت کے مرکز سے علیحدہ کر کے اسے محض نمائشی سربراہ بنا کر رکھا جاسکے جس کے فرائض اب مذہب کے دائرے تک محدود تھے اور اب اس کا ریاست کے امور میں کوئی خاص مقام اور کردار نہ تھا۔

خلیفہء خدا

سنّی روایات کے مطابق مذہبی معاملات "امام" کے دائرہ اختیار میں آتے ہیں لیکن پوپ

کے مقابلے میں امام کے پاس کوئی مذہبی "اختیار" نہیں۔ جیسا کہ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ اسلام کسی مذہبی پیشوائی یا پوپ کے تصور کو تسلیم نہیں کرتا۔ مذہب انفرادی شعور کا حصہ ہے۔ امام درحقیقت وہ رہنما ہیں جو کہ اپنی ذاتی اور مذہبی کاملیت اور علم میں کمال فن کی باعث امام تسلیم کئے جاتے ہیں امام کی کوئی تعیناتی نہیں کرتا۔ گذشتہ روایات کے برخلاف عباسی دور کے آخری ایام میں خلیفہ کے ساتھ برائے نام (nominal) مذہبی اہمیت کو منسلک کر دیا گیا۔ اس صورتحال نے مزید اس وقت نمو پائی جب خلیفہ اور امام کے تصور میں تصادم پیدا ہوا۔ یہ اسی عہد کی وہ بگڑی ہوئی روایات تھیں جن کو (مولانا) آزاد نے اوپر بیان کئے گئے الفاظ میں رقم کیا ہے۔

اس کے ساتھ ہی "خلیفہ" کے ساتھ منسلک مذہبی حضائص میں بھی اضافہ ہو گیا۔ اس عہد میں خلیفہ کو "خلیفہ اللہ" یعنی "خلیفہ خدا" یا جانشین کے طور پر پکارا جانے لگا۔ (مولانا) آزاد نے دراصل اسی خلیفۃ اللہ کا تصور ہی ذہن میں رکھ کر خلیفہ کے معنی اور مفہوم کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا۔ جن معنوں میں آزاد نے عام طور پر خلیفہ اللہ کے تصور کو استعمال کیا ہے اسے کلاسیکل اسلامی فقہاء نے مکمل طور پر مسترد کر دیا ہے اور یقیناً آزاد جیسا شخص ان تاریخی حقائق سے لاعلم نہ تھا۔ الماوردی خلافت اللہ کی شدید مخالفت کرتے ہوئے اپنے کلاسیکل کام "الاحکام السلطانیہ" میں اس بات سے بالکل متفق نہیں کہ خلیفہ کو خلیفۃ اللہ کہا جائے۔ علماء کا اس بات سے اتفاق ہے کہ اس لفظ کا استعمال نہیں کیا جا سکتا بلکہ ایک نے تو کہا کہ اسکا استعمال فجیر یعنی قابل گناہ ہے کیونکہ خلیفہ یعنی جانشین صرف اس شخص کا ہوتا یہ جو کہ یا تو غائب ہو جائے یا انتقال کر جائے۔ اللہ نہ تو غائب ہو سکتا ہے اور نہ ہی وہ مر سکتا ہے" (۱۷)

اگنے گولزر (Ignaz Goldziher) لکھتے ہیں کہ جب اموی حکمرانوں نے خلیفہ اللہ کا نمائشی لقب استعمال کرنا شروع کیا تو اس کے پس پشت مقصد یہ تھا کہ یہ بات بتائی جائے کہ حکمران لامحدود اختیارات کا حامل ہے۔ بعد میں آنے والے عباسی حکمرانوں کے دور میں اس لقب کو مزید مذہبی (Theocratic) مواد سے بھر دیا گیا۔ عثمانی سلطانوں کے متعلق یہ تصور کر لیا گیا کہ وہ بھی گزشتہ خلفاء کی طرح ان القابات کے اہل ہیں جو کہ صرف پرانے خلفاء کے لئے مختص تھے۔ جیسا کہ خلیفہ اللہ کا لقب بھی انھیں گزشتہ خلفاء سے منتقل کیا گیا (۱۸)۔ آزاد اپنے تصور خلیفۃ اللہ کی اساس عباسی عہد میں بگاڑی گئی روایات پر رکھتے ہیں۔ اس طرح آزاد اسلام کی سب سے پسماندہ

اور رجعت پسند روایات کی پیروی کرتے نظر آتے ہیں۔

سرسید احمد خان کا خیال اس مسئلے پر بالکل واضح طور پر مختلف تھا۔ وہ خلافت جو کہ ایک سیکولر کام تھا اور امامت جو کہ مذہبی مسئلہ تھا، کے بارے میں بڑے واضح موقف رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے یہ کہا کہ پیغمبر اسلام کے انتقال کے بعد حضرت ابوبکر خلیفۃ الرسول مقرر ہوئے تھے لیکن ان کے پاس کوئی دینی اختیار نہیں تھا۔ انھوں نے متواتر یہ بات لکھی کہ خلیفہ پروپیگنڈا روم کے کیتھولک پوپ کی طرح نہ تھے۔ سرسید نے اس بات کی نشاندہی کی کہ حضرت ابوبکر مسلمان معاشرے کے صرف انتظامی سربراہ تھے (۲۰)

ایک ہمعصر محقق ایم اے شعبان بھی بالکل یہی بات کہتے ہیں۔ انھوں نے لکھا کہ کوئی بھی شخص محمد ﷺ کا حقیقی جانشین ہونے کا دعویدار ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ کوئی بھی شخص ان کے برابر کی الہامی منظوری (sanction) نہیں رکھ سکتا تھا۔ اس لئے حضرت ابوبکرؓ کے پاس کوئی مذہبی اختیار نہ تھا۔ اس لئے ان کو کسی بھی طرح سے پوپ اور مقدس رومی بادشاہ (Holy Roman Empire) کا عظیم ملاپ نہیں کہا جا سکتا" (۲۱)

آخری عباسی عہد میں جبکہ خلیفہ کے پاس کچھ نہ بچا تھا سوائے دارالخلافہ کے اور وہاں بھی اسکا اختیار بڑا ہی محدود تھا، اس وقت مذہبی اعزازات حضائص میں بڑی تیزی کے ساتھ اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ خلیفہ کے ریاست پر کنٹرول کم ہونے کی وجہ سے وہ صرف ایک مذہبی رہنما کے طور پر باقی تھا نہ کہ ایک سیکولر نمائندے کے۔ اب خلیفہ متعدد جگہوں پر امام کے طور پر پیش کیا جا رہا تھا۔ اگنے گولڈزر Ignaz Goldziher لکھتے ہیں کہ:

> " آخری عباسی عہد میں خلیفہ کا لقب مکمل طور پر مذہبی معنوں (Theocratc Contacts) میں استعمال ہونا شروع ہوگیا اور یہ دعوے شروع ہوئے کہ خلیفہ اس ارض پر خدا کا نمائندہ ہے اور یہاں تک کہا گیا کہ وہ زمین پر خدا کا سایہ ہے"

اس وقت کے نظریہ سازوں نے سوچا کہ خلیفہ زمین پر خدا کا سایہ ہے۔ وہ تمام لوگ جو مسائل میں گھرے ہوئے ہیں وہ اس میں (یعنی ذلوالہی فی ارض یا ارضی کل معلبفون) پناہ تلاش کر سکتے ہیں۔ ان ہمعصر تحفوں نے نمائشی مذہبی القابات (Pompus theocratic Titles) لگا

کر خلیفہ کو بیشک بڑے مذہبی کے طور پر پیش کرنے کی کوشش کی لیکن دراصل اس کے پس پشت بادشاہوں کی دنیاوی معاملات میں اختیارات سے محرومی کو چھپانے کی خواہش تھی۔ عام طور پر یہ تصور تھا کہ چونکہ عثمانی سلطان اس وقت بیشتر اسلامی علاقوں پر حکمرانی کر رہے تھے۔ اس لئے انھیں خصوصی طور پر یہ اختیار حاصل تھا کہ وہ پرانے خلفائے کے القابات مثلاً خلیفۃ اللہ کا بھی استعمال کر سکتے ہیں (۲۳)۔ عثمانی سلطنت کی پروپیگنڈا مشینری نے عثمانی خلفاء کے مذہبی کردار کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے میں بڑا اہم کردار ادا کیا تا کہ دنیا کے دیگر مسلمانوں کی طرح ہندوستانی مسلمانوں کی وفاداریاں بھی عثمانی خلیفہ کے ساتھ منسلک کی جاسکیں۔ انڈیا میں اسلام کے خود ساختہ محافظوں نے اس تبدیلی کو بڑی کشادہ دلی سے قبول کیا۔ کیونکہ اس طرح ہندوستانی معاشرے میں ان کا اپنا مقام بھی مزید بلند ہوسکتا تھا اور وہ ہندوستانی سیاست اور ہندوستان کے مسلمان معاشرے میں خلیفہ اور "اس کے لوگوں" کے درمیان رابطہ کار (Mediator) کا کردار ادا کر سکتے تھے۔

تھوڑے ہی عرصے بعد "مسلمان" مفکرین اور اسکالرز "اختیاری" (Authoritative) مضامین، اختراعی خیالات اور دیگر مواد کے ساتھ سامنے آنا شروع ہو گئے۔ جس میں خلیفہ کے "مذہبی" کردار کو بڑھا چڑھا کر بطور "امام" تسلیم کئے جانے پر زور دیا جارہا تھا۔ وہ دن گزر گئے تھے جب ریاست کے سیکولر سربراہ کے طور پر خلیفہ کا باقاعدہ انتخاب عمل میں لایا جاتا تھا۔ جس کی مثال خلفاء راشدین یعنی ابتدائی چار خلفائے کا انتخاب تھا۔ خلیفہ کا یہ بدلا ہوا مذہبی پہلو اسلام کے ابتدائی دنوں کے اس تصور سے بھی متصادم تھا جہاں خلیفہ ریاست کا ایک سیکولر حکمران تھا اور امام بطور ایک مذہبی پیشوا کے اپنے فرائض انجام دیتا تھا۔ امیہ دور حکومت میں بھی جب کہ اموی حکمرانوں نے اپنے لئے لفظ "خلیفہ" کا استعمال شروع کر دیا تھا اس کے باوجود یہ عہدہ سیکولر ہی رہا۔ یہ بہت بعد تنزلی کے دور میں ہوا کہ یہ دونوں الفاظ ایک دوسرے کے اندر اس طرح گڈمڈ ہو کر رہ گئے کہ ان میں فرق کرنا مشکل ہو گیا اور جس طرح ہم نے اوپر (مولانا) آزاد کے خیالات میں دیکھا، یہ دونوں الفاظ یعنی خلیفہ اور امام ایک ہی سانس میں بولے جانے والے ہم معنی لفظ ہو گئے۔ اس لئے آزاد نے عثمانی سلاطین کے ادوار کی طرف اشارہ کرتے وقت دونوں الفاظ کے فرق میں کوئی تفریق نہیں کی ہے۔ مولانا آزاد کا اوپر بیان کیا گیا خیال بھی درحقیقت ان

بگڑے ہوئے ادوار کی ہی ان غلطیوں کی نشاندہی کرتا ہے جب ان الفاظ کے معنی و مطلب میں کوئی فرق نہ رہا۔

عالمگیری خلافت

مولانا آزاد کی تقریروں سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ہر دور میں صرف ایک خلیفہ ہی رہ سکتا ہے۔ اگر آزاد کی اس بات کو تسلیم کر لیں ہو تو پھر ہمیں مسلم تاریخ کے بہت سے واقعات سے آنکھیں بند کرنا پڑیں گی۔ اسلامی تاریخ کے مختلف ادوار میں ایک ہی وقت میں کئی حریف خلفاء مسلم دنیا کے مختلف علاقوں پر حکمرانی کرتے رہے ہیں۔ کئی خلیفہ ایک ساتھ ایک ہی وقت میں بھی حکمران رہے۔ اس کی سب سے اہم مثال تو ہم یوں دے سکتے ہیں کہ جس وقت بغداد میں عباسی خلیفہ حکمران تھے اسی وقت اسپین میں امیہ خلیفہ حکمرانی کر رہے تھے جبکہ مصر میں فاطمی خلفاء کی حکمرانی تھی۔ ان تین حریف خلفاء کے علاوہ اس وقت کئی دیگر خود مختار مسلمان بادشاہتیں اپنا وجود رکھتی تھیں جن کے حکمران بھی خلیفہ ہونے کے دعوے دار تھے۔

C.E. Boswarth نے اس پر بڑا جامع تحقیقی کام کیا ہے اور اس کا خیال ہے کہ اس وقت کم از کم بیاسی (۸۲) مختلف اسلامی خلفاء مختلف علاقوں میں حکمرانی کر رہے تھے (۲۴)۔ اسلام کی طویل تاریخ میں دیکھا جائے تو یہ عثمانی سلطان تھے کہ جنہوں نے تمام اسلامی دنیا کے لئے ایک واحد "عالمگیر خلیفہ" کے تصور کو اسلامی سیاست کا ایک بنیادی جز بنا دیا۔ اور یہی وہ بنیاد تھی جس کے ذریعے وہ اپنے اس دعوے کی حمایت میں ہندوستانی مسلمانوں سے وفاداری کے خواہش مند تھے۔ عالمگیری خلافت کا یہ تصور غیر تصدیق شدہ حقیقت پر مبنی تھا اور یہی وہ خوش فہمی تھی جس پر خلافت تحریک کی عمارت کھڑی کی گئی تھی۔

آزاد نے یہ دعویٰ کیا کہ یہ اسلامی شریعت ہے کہ ہر دور میں مسلمانوں کے لئے ایک "خلیفہ" اور "امام" ہونا ضروری ہے یعنی عالمگیر خلیفہ۔ لیکن اپنا دعویٰ کرتے ہوئے اس نے کسی ماخذ کا ذکر نہیں کیا جہاں یہ شرعی قانون بتایا گیا ہو آزاد نے بہت بڑے بڑے دعوے دریا دلی اور بغیر کسی ماخذ اور اسلامی تاریخ سے ٹھوس ثبوت پیش کئے بناء بیان کر دیئے ہیں۔ آزاد کے مخاطبین جس میں زیادہ تر نیم تعلیم یافتہ اور نیم جاہل (ill-informed) لوگ تھے وہ تو آزاد کی تقاریر میں

ان کے عربی زبان میں کئے گئے حوالوں سے ہی متاثر ہو جاتے تھے جن کا کہ وہ اپنی تقریروں کے دوران بھرپور استعمال کرتے تھے۔ دیکھا جائے تو لگتا ایسا ہے کہ درحقیقت آزاد کی پہلی زبان عربی ہی تھی۔ ان لوگوں کے پاس آزاد کے کئے گئے دعوؤں کی حقیقت جاننے کے لئے کوئی اور طریقہ کار نہیں تھا۔ ان حاضرین کے لئے آزاد اور دیگر لوگوں کے خیالات مکمل طور پر قابل قبول تھے کیونکہ وہ ان کی صداقت کو پہلے ہی سے تسلیم کر چکے تھے۔ اس کے پہلے کے اسکالرز جنھوں نے اس کو مذہبی رنگ میں پیش کیا ان کے خیال میں وہ صرف نعرے باز لیڈر (cheer- leader) تھے۔

سرسید احمد خان نے خلافت کے عالمگیری تصور کے خلاف بھرپور انداز میں دلائل دیئے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ ہر خلیفہ کا اختیار اس مخصوص علاقے تک محدود تھا جو کہ براہ راست اس کے زیر حکمرانی تھا۔ خلافتیوں نے سرسید احمد خان کی اس دلیل کو مسترد کرتے ہوئے انھیں انگریز کا غلام کہنا شروع کر دیا جو کہ اپنے آقاؤں کی بولی بول رہا تھا۔ ان کا خیال تھا یہ سب کچھ ان سے برطانوی حکمران کہلوا رہے ہیں جو کہ کسی طرح سچ نہ تھا۔ اگر دیکھا جائے تو یہ مولانا آزاد تھے نہ کہ سرسید احمد خان جو کہ اس وقت اس مسئلے پر عثمانی خلیفہ کے لئے حکومت برطانیہ کی ہمدردانہ پالیسیوں کے عین مطابق کام کر رہے تھے یہ آزاد تھے جو کہ خلافت کے عالمگیری تصور کی حمایت کرتے ہوئے درحقیقت برطانوی پالیسیوں کی تائید کر رہے تھے۔ ان لوگوں کے سرسید احمد خان پر برطانیہ کے ہمدرد ہونے کے الزامات کو ایک طرف رکھتے ہوئے یہ بات اہم ہے کہ سرسید کا خلافت کے سوال پر موقف اصولوں پر مبنی تھا اور اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ انکے یہ خیالات برطانیہ کی خواہشات کے بالکل برعکس تھے۔ یہ ایک کلی طور پر دوسرا پہلو ہے کہ سرسید پر انگریزوں کے کٹھ پتلی (puppet) ہونے کی۔ مختلف اوقات میں چاہے درست یا غلط وجوہات کی بناء پر وہ برطانوی ہمدرد (Pro-British) رہ چکے ہوں لیکن اس کے باوجود انہیں کسی بھی صورت کٹھ پتلی کہنا درست نہیں۔ جس طرح اس مثال سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ سرسید احمد خان کا "عالمی خلافت" کے تصور سے انحراف درحقیقت برطانیہ اور ترکی کے پروپیگنڈے کو چیلنج کرنے کے مترادف تھا۔

عثمانی خلفاء سے برطانوی تعلقات

خلافت تحریک کے اس پروپیگنڈے کے برخلاف کہ برطانیہ سلطنت عثمانیہ کا دشمن ہے،

حقیقت یہ ہے کہ برطانوی حکمران گذشتہ کئی صدیوں سے سلطنت عثمانیہ کے سب سے بڑے اتحادی اور حمایتی تھے۔ برطانیہ کا عثمانی سلطنت سے یہ اتحاد بغیر کسی وجوہات اور مفادات کے نہ تھا بلکہ اس کے پس پشت روس کے بڑھتے ہوئے توسیع پسندانہ عزائم تھے۔ عثمانی حکمران بھی روس کے بڑھتے ہوئے خطرات سے شدید پریشان تھے اور اپنی بڑھتی ہوئی کمزوریوں کے باعث وہ مزید پریشان ہوتے جارہے تھے۔ اس وقت انھیں ایک مضبوط اور طاقتور اتحادی کی ضرورت تھی جو کہ انھیں برطانیہ کی صورت میں مل گیا تھا۔ سلطانی حکمرانوں کا پہلی جنگ عظیم میں وقتی طور پر جرمنی کے ساتھ اتحاد ان کی برطانیہ سے طویل اتحادی تاریخ اور تعلقات میں ایک مختصر وقفہ تھا یقیناً اس تبدیلی کے پس پشت کئی مجبوریاں حائل تھیں۔ ترکی کا جرمنی سے یہ انحرافی اور چونکا دینے والا جنگی اتحاد درحقیقت ترکی کے ان اندرونی حالات کا نتیجہ تھا جسکا کہ عثمانی حکمرانوں کو سامنا تھا۔ برطانیہ کی حتی الامکان کوشش تھی کہ ترکی اس جنگ میں اپنے آپ کو نہ الجھائے لیکن تمام تر کوششوں کے باوجود ترکی نے اس جنگ میں اپنے روایتی اتحادی کے خلاف بناء کسی سوچ بچار کے حادثاتی طور پر اپنے آپ کو الجھا دیا۔ ہم اس دلچسپ صورتحال کے متعلق مزید لکھیں گے۔

برطانیہ کے عثمانی سلطنت کے ساتھ تعلقات اس کے اپنے استعماری مفادات کو مدنظر رکھ کر بنائے گئے تھے۔ ان مفادات کے پس پشت سلطنت کے جغرافیائی محل وقوع اور خاص طور پر برطانوی سلطنت کو زارِروس کی طرف سے لاحق خطرات تھے۔ برطانیہ کے لئے عثمانی سلطنت وہ قیمتی دفاعی دیوار (Valuable Bulwark) تھی جو کہ روس کی راہ میں حائل تھی۔ سولہویں صدی سے بحری تجارتی راستوں کے کھلنے کے بعد سے صورتحال میں بڑی تبدیلی ہو چکی تھی اور بین الاقوامی دفاعی ترجیحات بڑی حد تک تبدیل ہو چکی تھیں۔ اس نئی تبدیل شدہ صورتحال میں وسیع عریض زمینوں پر قبضے کی بجائے سمندروں پر قبضہ زیادہ سود مند سمجھا گیا۔ تمام بڑی استعماری طاقتیں سمندری حدود پر قابض ہونے کی خواہش مند تھیں بہت جلد برطانیہ ایک بہت بڑی بحری قوت بن کر ابھرا اور اس نے اپنا اثر ورسوخ دنیا کے کئی علاقوں تک پھیلا لیا۔

طاقت کے اس نئے عالمی کھیل میں زارروس کے لئے کئی مجبوریاں اور رکاوٹیں تھیں۔ اس کی سمندری قوت جغرافیائی محل وقوع کی وجہ سے کئی مشکلات کا شکار تھی۔ اس کا Baltic Fleet

اس تنگ سمندری گزرگاہوں میں جو کہ سویڈن کو جرمنی اور ڈنمارک سے الگ کرتی تھی کئی مشکلات کا شکار تھا۔ اس کا Black Sea میں موجود بحری بیڑہ اور Dardanelles کے مقامات پر بھی شدید خطرات سے دوچار ہوسکتا تھا۔ اس کا مشرقی بیڑہ جو کہ ولاڈیواسٹک Vladivostock کے مقام پر تھا وہ بہت دور اور عام گزرگاہوں سے الگ تھلگ تھا اور کسی بھی کھیل کی صورت میں کوئی مؤثر کردار ادا کرنے کے قابل نہ تھا روس کو عالمی قوت بننے کے لئے سمندروں تک مزید آزاد رسائی ضروری تھی۔ اس صورتحال میں روس کے پاس بہترین راستہ یہ تھا کہ وہ اپنے آپ کو جنوب کی طرف توسیع دے جو کہ اسے خلیج فارس اور بحیرہ عرب کے سمندروں میں مؤثر (Dominating) حیثیت دے سکتی تھی۔ لیکن روس کی یہ پیش قدمی برطانیہ کے استعماری مفادات کے لئے براہ راست خطرے کی گھنٹی بن سکتی تھی۔

عثمانی سلطنت روس کے جنوب میں سفر اور گرم پانیوں تک پہنچنے کی خواہش میں سب سے اہم منزل تھی۔ روس کے بحیرۂ عرب تک پہنچنے کے لئے ضروری تھا کہ وہ عثمانی طاقت کو نیست و نابوت کرے اس لئے روس کی پالیسیاں ہمیشہ سے عثمانی سلطانوں کے ساتھ دشمنی پر مبنی تھیں۔ روس کے جنوب کی طرف بڑھنے کے خوف سے سلطنت عثمانیہ اور برطانیہ کے خدشات اور مفادات یکجا ہوگئے جس نے ان دونوں کے درمیان پہلے سے قائم اتحاد کو مزید مضبوط کردیا اور یہ اتحاد مزید کئی صدیوں تک چلا۔ انھوں نے کئی جنگیں بحیثیت اتحادی ساتھ لڑیں جن میں سب سے مشہور، طویل اور مہنگی جنگ (دولت اور انسانی خون کے حساب سے) کریمین کی جنگ (Crimean War) تھی جو کہ 56-1854 کے درمیان لڑی گئی۔ اس جنگ کا اختتام برطانیہ کی عین خواہشات کے مطابق اس معاہدے پر ہوا جس کے تحت Bosphorous اور Dardnelle کے علاقوں میں کسی بھی قسم کی جنگی بحری حرکات وسکنات پر پابندی لگادی گئی جس کا براہ راست مطلب اس علاقے میں روس اور اس کے بحری بیڑے کے اثر ورسوخ کو کم کرنا تھا۔ اس معاہدے کے نتیجے میں روس کا جنوبی سمندری بحری بیڑہ بحیرۂ اسود (Black Sea) میں پھنس کر رہ گیا۔

سلطنت عثمانیہ کی توسیع پسندی اور تنزلی

عثمانی سلطنت اپنی طاقت کے عروج پر سترھویں صدی میں اس وقت پہنچی جب عثمانی

سلطان کی فوجوں نے ویانا کا دوسری بار محاصرہ کیا۔ اس لمحے کے بعد یورپ میں عثمانی طاقت کا آہستہ آہستہ سے زوال شروع ہو گیا۔ ترکی کو جلد ہی ڈینیوب اور دریائے سوا (Sawa River) (سابقہ یوگوسلاویہ) کے درمیان اپنے مقبوضہ یورپی علاقے ہبسبرگ (Habsburg) اور روس کے ساتھ اٹھارویں صدی میں لڑی جانیوالی جنگوں کے نتیجے میں چھوڑنے پڑے۔ لیکن عثمانوی سلطنت کا اختتامی زوال اس تضاد کا نتیجہ تھا جو کہ ترکی اور دو عظیم طاقتوں کے درمیان لڑائی کی صورت میں نکلا۔ یہاں ترکی کی شکست کی ذمہ دار جنوب کے سلف (slavs) لوگوں کی قومی تحریک تھی جو اپنی قومی آزادی کی جنگ میں دونوں استعماری سلطنتوں یعنی عثمانیہ اور ہبسبرگ آسٹرو ہنگری شہنشاہوں (Habsburg Austro- Hungarian) سے لڑے۔ جبکہ دوسری طرف ہندوستان میں اردو پریس نے اس جنگ کو اسلام کے خلاف عیسائیت کی جنگ بنا کر پیش کرنا شروع کر دیا۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ جنگ قوم پرستی کی جنگ تھی جو کہ نو آبادیاتی (Colonialism) کے خلاف لڑی جا رہی تھی۔

یہ کشمکش طاقت اور زمین کے حصول کے لئے تھی۔ مذہب کا اس معاملے میں کوئی دخل نہ تھا۔ "مسلمان" عثمانیوں نے اپنے "مسلمان بھائیوں مثلاً عربوں کو اپنے زیر اثر لانے اور وہاں اپنا نو آبادیاتی اقتدار قائم کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہ کی۔ انھوں نے کئی متواتر لیکن ناکام کوششیں اپنے دوسرے مسلمان "بھائی" یعنی ایران کے صفوی حکمرانوں کو فتح کرنے کے لئے کیں۔ عثمانی توسیع پسندی کی کوششوں کا مذہب سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ یہ تو صرف علاقے اور طاقت کے حصول کے لئے تھیں۔ اسی طرح سلطنت عثمانیہ کے کئی علاقوں کی مسلمان عوام بھی ترکی سے اپنی آزادی کے لئے بے چین تھی۔ M.D. Stojanovic لکھتے ہیں کہ مرکزی طاقت کی کمزوری نے سلطنت عثمانیہ کے کئی صوبائی پاشاؤں میں خود مختاری کے حصول کی پہلے سے موجود خواہش کو مزید تقویت دی۔ سلطنت عثمانیہ کو اس عرصے میں کئی "مسلمان بغاوتوں" کا سامنا کرنا پڑا جن میں ایک مشہور بغاوت مصر کے محمد علی کی تھی (۳۵)۔ بجا طور پر اس بغاوت کو قومی تحریک کے بجائے ایک فوجی مہم جوئی کہا جا سکتا تھا۔ جہاں تک اس الزام کا تعلق ہے کہ بلقان کے علاقے میں شروع ہونیوالی آزادی کی تحریکیں "اسلام" کے خلاف "عیسائیوں" کی جنگیں تھیں تو اس میں کوئی سچ نہ تھا۔ کیونکہ ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ یہ ہبسبرگ (Habsburg) تخت کے "عیسائی"

جانشین آرچ ڈیوک فرانسس فرڈیننڈ (Archduke Francis Ferdinand) کا ایک دوسرے سربیائی نسل کے "عیسائی" ایک اور سربیائی قوم پرست عیسائی کے ہاتھوں سرایبور (Sarajevo) کے مقام پر قتل تھا جو کہ پہلی جنگ عظیم کے آغاز کا موجب بنا۔ یہ بڑی مضحکہ خیز بات ہے کہ انڈیا کے مسلمان اور کٹر علماء بلقان کی اس بڑی پیچیدہ صورتحال کو بڑا ہی سادہ سمجھتے ہوئے اسے صرف اسلام کے خلاف ایک عیسائی حملہ تصور کر رہے تھے۔ جبکہ اصل بات یہ ہے کہ اس تصادم کے پس پشت قومی سوال کو بڑی اہمیت تھی۔ انیسویں صدی پوری دنیا میں درحقیقت قوم پرستانہ جذبات کے بڑھاوے کی صدی تھی اور یہی صورتحال انڈیا میں بھی تھی۔ بالکان کی قومی تحریکیں بھی اسی عالمی صورتحال سے متاثر تھیں اور اصل صورتحال یہ تھی کہ محکوم عوام نے حکومتوں کے خلاف اپنی آزادی کی جدوجہد کو تیز کر دیا تھا۔

یونان کی آزادی

ہندوستان کے خلافتیوں کا یہ وہم تھا کہ برطانیہ یونان کا حمایتی اور ترکی کا مخالف تھا۔ یہ الزام وقتی طور پر جنگ کے دنوں کے برطانیہ کے عارضی وزیراعظم لارڈ جارج (Lloyd George) پر تو لگایا جا سکتا ہے جو کہ اس مرحلے پر ایک مخلوط حکومت چلا رہے تھے نے جنگ میں شکست کے بعد ترکی پر ذلت آمیز شرائط پر مبنی ایک معاہدہ تھوپا لیکن ساتھ میں یہ بات بھی واضح ہونی چاہئے کہ اسکے اس اقدام کی اس کی کابینہ کے قدامت پسند (conservative) بونر لاء (Bonar Law) نے بھی اراکین کابینہ بشمول پسند کی نگاہ سے نہ دیکھا اور یہی وجہ تھی کہ اس معاہدے کی نہ ہی توسیع نہ کی گئی اور نا ہی اس پر عمل درآمد ہوا۔ اسی وجہ سے جنگ کے اختتام پر لاؤڈ جارج کی مخلوط حکومت کے اقتدار سے محروم ہونے کے بعد آنے والی تنگ نظر حکومت (Conservative Government) نے بونر لاء کے زیر قیادت ایک بار پھر ترکی اور عثمانیہ سلطنت کی حمایت کرنے کی برطانیہ کی گذشتہ روایت کو دوبارہ بحال کر دیا۔ اس لئے اس فرق کو سمجھنا نہایت ضروری ہے جو کہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

جہاں تک مشرقی Mediterranian میں برطانیہ کی طویل المدت منصوبہ بندی کا تعلق ہے تو اس صورتحال میں برطانیہ کبھی بھی یونان کا حمایتی نہیں رہا اور اس علاقے میں برطانیہ کی اس

پالیسی کے پس پشت بھی زار روس کا خطرہ ہی لاحق تھا۔ جہاں تک یونان کی ترکی سے آزادی کی تحریک کا سوال ہے تو برطانیہ کی عوام میں اس تحریک کے لئے مضبوط حمایت اور ہمدردی کے باوجود برطانوی حکومت اس آزادی کی حامی نہ تھی کیونکہ برطانیہ کو خوف تھا کہ آزادی کے بعد یونان ترکی کی دشمنی میں روس کا حمایتی بن سکتا تھا اور اس کے نتیجے میں روس کو مشرقی Mediterrariean کے علاقے میں پاؤں جمانے کا موقع مل جاتا۔ بحرحال برطانیہ میں شدید عوامی ردعمل اور ۱۸۲۶ میں لارڈ بیرن (Lord Byron) کی موت کے بعد جو کہ یونان کی آزادی کے لئے آواز اٹھاتا رہا اور یونانی کی آزادی کے لئے لڑتے ہوئے ہی مسلونگی (Missolonghi) میں انتقال کر گیا۔ اس کے بعد برطانوی حکومت نے مجبور ہو کر نیم دلی سے یونان کی حمایت کرنے کا فیصلہ کیا۔ جس کا اختتام ۱۹۲۹ کے معاہدہ ایڈرینوپول پر ہوا۔ برطانوی حکومت اس معاہدے سے اسی طرح ناخوش تھی جس طرح کہ ترکی جیسا کہ W.M. Gewehr لکھتے ہیں کہ "بالکان میں روسی خوف کی وجہ سے برطانیہ کسی بھی طرح یونان کی حمایت کرنے کو تیار نہ تھا۔ تاوقت کہ ۱۸۳۲ میں آخری معاہدہ دستخط ہوا جسکے نتیجے میں بالآخر ایک آزاد یونانی ریاست کے قیام کی شکل سامنے آئی۔ پھر بھی نئی وجود میں آنے والی یونانی ریاست اس کٹی بٹی صورت میں سامنے آئی کہ اس کے کئی ترکی کے حوالے ہی رہے۔ یونان کی آزاد ہونے والی ریاست کو آزادی کے بعد بھی کئی علاقے نہ ملنے کی وجہ سے یونانی آبادی کے ایک بڑے حصے کو آزادی کے بعد بھی ترکوں کے رحم وکرم پر بھی چھوڑ دیا گیا۔ اس کے پس پشت بھی برطانیہ کے مفادات تھے جس کا اظہار برطانیہ کے وزیراعظم اور Duke of Wellington نے اپنے الفاظ میں اس طرح کیا کہ یونان بالآخر روس کی ایک سیٹیلائیٹ ریاست بن کر رہ جائے گی اس لئے ضروری ہے کہ اس کو کم سے کم علاقہ دیا جائے (۶۲)۔ یونان کی آزادی کے بعد بھی عثمانی سلطنت کے لئے برطانوی تائید (Commitment) وحمایت میں کوئی کمی نہ آئی۔

ہندوستان میں برطانیہ کے لئے عثمانی خدمات

مسلمانان ہند کی طرف سے ترکی کے سلطان کو عالمگیر خلیفہ تسلیم کئے جانے کا واقعہ نسبتاً تاریخ کا تازہ واقعہ ہے۔ مغلوں کے لئے ترک سلطانوں کی بالادستی کسی بھی طرح قابل قبول نہ تھی۔ بلکہ

حقیقت یہ ہے کہ وہ طاقت، دولت اور سلطنت کے محل وقوع کے حساب سے سلطنت عثمانیہ کو اپنا حریف سمجھتے تھے جس پر کہ وہ قبل ازیں حکمرانی کر چکے تھے۔ یہ برطانوی دور میں ممکن ہو سکا کہ برطانیہ کی حوصلہ افزائی اور حمایت کے نتیجے میں ہندوستان کے مسلمانوں میں ترکی کے سلطان کو عالمگیری خلیفہ کے طور پر پیش کرنے کے لئے پروپیگنڈہ شروع کیا گیا اور مسلمانان ہند پر یہ زور دیا گیا کہ اپنی وفاداریاں سلطنت عثمانیہ کے ساتھ جوڑیں۔ برطانیہ کو اس بات کا اندازہ تھا کہ وہ مسلمانان ہند کو سلطنت عثمانیہ کا وفادار بنا کر نظریاتی اور مذہبی طور پر عثمانی خلیفہ کے ذریعے ہندوستانی مسلمانوں میں اپنے خلاف تحریک اٹھانے سے روک سکتا ہے۔ برطانیہ نے اس صورتحال کے ذریعے اپنے مفادات کی بہتر تکمیل ہوتے دیکھ کر عثمانی خلیفہ کی حمایت میں پروپیگنڈہ شروع کر دیا۔ اس کے بدلے خلیفہ نے بھی برطانیہ کے مفادات کی خوب خدمت کی۔ اس کی پہلی مثال اس وقت سامنے آئی جب ۱۷۸۹ میں ٹیپو سلطان نے مغلوں سے بغاوت کرتے ہوئے عثمانی خلیفہ سے اپنی وفاداری کا عہد کیا جس کے جواب میں خلیفہ نے اسے خلوت عطا کرتے ہوئے اسے میسور کا حکمران تسلیم کر لیا۔ واضح رہے کہ ٹیپو کی حیثیت اس ہیرو (legendary) کی ہے جسے ہندوستانی تاریخ میں برطانوی کے سامراجی اقتدار کے خلاف لڑنے والے مزاحمتی ہیرو کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ ۱۷۹۸ میں برطانیہ کی درخواست پر عثمانی خلیفہ نے ٹیپو سلطان کو مراسلہ لکھا کہ جس میں خلیفہ نے برطانیہ کی سفارش کرتے ہوئے ٹیپو کو برطانیہ کہ خلاف اپنے دشمنانہ رویئے پر نظر ثانی کرنے کا مشورہ دیا کیونکہ برطانیہ سلطنت عثمانیہ کا اتحادی تھا۔ یہ مراسلہ ٹیپو سلطان کو براہ راست نہ بھیجا گیا تھا بلکہ بلواسطہ طور پر Lord Wellesley کے ذریعے بھیجا گیا جو کہ حیرت انگیز طور پر ٹیپو سلطان سے لڑائی میں مصروف برطانوی فوج کی سربراہی کر رہا تھا۔ ٹیپو نے اپنے جوابی مراسلے میں خلیفہ سے اپنی وابستگی کا دوبارہ اعادہ کرتے ہوئے اسے بڑے ادب سے لکھا کہ چونکہ خلیفہ ہندوستان سے بہت دور بیٹھے ہیں اس لئے انھیں سیاسی معاملات سے مکمل آگاہی حاصل نہیں۔ اس نے (Cheekily) خلیفہ کو یہ دعوت دی کہ وہ اس کے ساتھ شامل ہو کر کافروں (infidels) کے خلاف جنگ میں اس کا ساتھ دے۔ ایک اہم موقع جب دوبارہ عثمانی خلیفہ برطانیہ کی حمایت میں سامنے آیا وہ تکلیف دہ مرحلہ تھا جب ہندوستان میں ۱۸۵۷ کی جنگ آزادی شروع ہوئی۔ تاریخ دانوں نے اس لڑائی کی اہمیت کو کم کرتے ہوئے اسے ہندوستانی

بغاوت (Mutiny) بھی کہا ہے۔ عثمانی خلیفہ عبدالمجید نے بغاوتیوں کے اس اقدام کی مزمت کرتے ہوئے ہندوستانی مسلمانوں پر زور دیا کہ وہ برطانیہ کے وفادار رہیں۔ اس کا یہ کہنا تھا کہ برطانیہ "اسلام کا محافظ" ہے۔ برطانیہ کا خیال تھا کہ ہندوستان کے مسلمان کو قابو میں رکھنے کے لئے عثمانی خلیفہ کو استعمال کیا جا سکتا تھا۔ اسی خوش فہمی میں انھوں نے Tyrant سلطان عبدالعزیز کے ۱۸۶۷ کے دورہ لندن کے موقع پر اس کی خوب آؤ بھگت کی اور اس پر بے تحاشہ دولت لٹائی۔ اہم بات یہ ہے کہ خلیفہ کے اس دورے پر اٹھنے والا تمام خرچہ برطانوی حکومت نے ہندوستان سے حاصل ہونے والی آمدنی (Revenue) سے پورا کیا اور یہ خرچہ کرتے ہوئے یہ لکھا گیا کہ یہ خرچے اس لئے کئے جا رہے ہیں کہ سلطان کے ساتھ گرم جوشی کے تعلقات بحال کر کے ہندوستان میں برطانوی حکومت کے لئے مزید آسانیاں پیدا کی جا سکیں گی۔ سلطان کو استعمال کر کے ہندوستانی مسلمانوں کو برطانیہ کے زیر استعمال لانے کی ایک اور کوشش کی جا سکتی تھی (۲۷)۔

مسلمانان ہند کے ترکی کے لئے ہمدردانہ روئے کی تشکیل

انیسویں صدی کی ابتداء تک ہندوستانی مسلمانوں کا ترکی اور عثمانی خلافت کی طرف بیگانگی (largely indifferent) کا رویہ تھا۔ برطانیہ کے مفادات سے قطعہ نظر دیگر دو اہم سماجی تبدیلیاں وقوع پذیر ہوئیں جنھوں نے مل کر ہندوستانی مسلمانوں میں ترکی کے لئے ہمدردانہ پروپگنڈے کو آگے بڑھانے کا موقع دیا۔ ان دونوں تبدیلیوں کے جنم لینے کے پس پشت بالکل دو مختلف وجوہات تھیں لیکن اس کے درمیان کچھ نہ کچھ اندرونی تعلق تھا جس کی وجہ سے وہ ایک مرکز پر آ کر جمع ہو گئیں۔

ان میں پہلی چیز پڑھے لکھے درمیانے درجے کے مسلمان طبقے کا ابھر کر سامنے آنا تھا۔ مسلمانوں کا یہ طبقہ روایتی مدرسوں میں پڑھ لکھ کر سامنے نہ آیا تھا جہاں کے تعلیم کا عمل علماء آگے بڑھاتے تھے۔ یہ طبقہ برطانوی نظام تعلیم کے نتیجے میں آگے آیا تھا کہ نوآبادیاتی حکومت نے لارڈ میکالوے کی فروری ۱۸۳۵ کی تجاویز کے نتیجے میں متعارف کرایا تھا۔ اس نظام تعلیم کو اس مقصد کے تحت ترتیب دیا گیا تھا کہ اس کا کام نوآبادیاتی ریاست کے لئے افسر شاہی، کلرک اور صحافی پیدا کرنا تھا۔ ان کی ضرورت یہ تھی کہ وہ انگریزی بولنے والے صاحبوں اور مقامی آبادی کے

درمیان رابطہ کا کام کرسکیں۔ نہرو نے اس نظام تعلیم کو " کلرکوں کی قوم" (Nation of Clerks) پیدا کرنے سے تعبیر کیا۔ نوکری پیشہ طبقہ درمیانے طبقے کا وہ حصہ تھا جس کا اصل مقصد ریاست کی نوکری کا حصول تھا۔ ان کا اصل مقصد " تعلیم" (Education) حاصل کرنا نہ تھا بلکہ ان کا مطمئہ نظر صرف " تعلیمی قابلیت (Educational Qualification) یعنی سند اور ڈپلومہ حاصل کرنا تھا جو کہ انھیں سرکاری ملازمت دلانے کے لئے اجازت نامہ (Passport) بن سکتی ہو۔ ایک نو آبادیاتی معاشرے میں جس کی بنیاد زرعی پیداوار پر تھی۔ اس معاشرے میں تنخواہ دار طبقے نے بالآخر شہری معاشرے میں کلیدی کردار ادا کرنا تھا اور وہ سیاسی بحث ومباحثوں میں بھی نئی سمتوں اور موضوعات کا تعین کرتا تھا۔ اس طرح تنخواہ دار طبقہ ایک اہم طبقہ بن کر ابھرا جس نے سماجی اور سیاسی طور پر بڑی اہمیت حاصل کرلی۔ یہی وہ طبقہ تھا جو اخبار کا قاری بن گیا جب اخبار قابل خرید ہوگیا۔

مسلمان تنخواہ دار طبقہ خصوصاً یوپی (U.P) کے افراد وہ بدقسمت (disgruntled) طبقہ بن گیا جس کو ریاست کی ملازمین کھونی پڑیں خاص طور پر وہ مراعاتی اور اعلی درجے کی ملازمتیں جس پر وہ اب تک بھاری تعداد میں قابض تھے۔ نفسیاتی طور پر اس طبقے کو اس راستے (Avenues) کی تلاش تھی جس کے ذریعے وہ اپنی تکالیف اور محرومیوں کا اظہار کرسکتے۔ اسی دوران جب ترکی کی بالکان میں پے در پے شکستوں کی خبریں آنے لگیں اور ان خبروں کو ان تک عیسائیوں کے ہاتھوں عالم اسلام کی شکست سے تعبیر کر کے پہنچایا جانے لگا تو اس موسیقی نے ان کے پہلے مذہبی پراگندہ ذہنون (communalist minds) کو مزید گندہ کرنا شروع کردیا۔" ترکی کی تقدیر" ایک وہ آئینہ تھا جس میں وہ اپنی تباہی کا درد محسوس کرسکتے تھے۔ "ترکی کے المیہ" کو دیکھتے ہوئے انھوں نے ترکوں سے اپنی دلی ہمدردی کا مظاہرہ کیا۔ اس کے نتیجے میں ایک نہایت طاقتور اتحاد (Solidarity) کا رویہ پیدا ہوا اور انھوں نے ترکی کے لئے امداد اکٹھا کرنا شروع کردی۔ برطانیہ نے اس رویئے کو نا صرف کشادہ دلی سے خوش آمدید کہا بلکہ اس کی بھرپور طریقے سے حوصلہ آفزائی کی جتنی ان سے ممکن تھی۔ وہ ہندوستانی مسلمانوں اور اس کے سرپرست (Protege) عثمانی خلیفہ کے درمیان بڑھتے ہوئے اس تعلق پر بہت خوش تھے۔

ایک اور اہم سیاسی بنیاد جس کے باعث سلطنت عثمانیہ کے لئے ہمدردی کے جذبات بڑی

تیزی سے سامنے آئے وہ مقبول (Popular) اردو صحافت کا ابھر کر سامنے آنا تھا۔ اس سے پہلے کے اخبارات بڑی محدود اشاعت رکھتے تھے اور وہ بھی مراتی یافتہ طبقوں اور کاروباری افراد تک مشتمل تھے جس میں زیادہ تر خبریں حکومت کے معاملات تک محدود ہوتی تھیں۔ اس میں سے زیادہ تر "اخبارات" موادتی (Manuscript) طرز پر ہوتے تھیں۔ اردو میں چھپائی بھی رواج پذیر تھی اور دھاتی نقش کا طریقہ بھی کچھ عرصے سے موجود تھا۔ لیکن نقش (naskh) کا طریقہ کار عوامی سطح پر زیادہ مقبول نہ تھا اور نسبتاً مہنگا بھی تھا جبکہ اس کے مقابلے میں خطاطی (Calligraphic) کا نستالیقی (nastalique) طریقہ کار زیادہ رواج پذیر اور مقبول عام ہو چکا تھا۔ جیسا کہ بعد میں یہ بات ہوئی کہ چھپائی کا سب سے بہترین اسکرپٹ نسبتاً لیگ لیتھوگرافی (lithography) ثابت ہوا اس نے مسلمان نوکری پیشہ ورانہ میں بڑی مقبولیت حاصل کر لی حالانکہ لتھو پرنٹنگ پریس کی ایجاد ۱۷۹۶ میں ہوئی تھی۔ اس سے پہلے کہ اسے اخبارات کو کثیر تعداد اور نسبتاً ازاں قیمت میں چھاپنے کے لئے استعمال کیا جاتا اس میں بہتری لانے کی شدید ضرورت تھی۔ ۱۸۵۰ تک پہلی میکانائز لیتھو پرنٹنگ پریس کا استعمال عام ہو گیا اور انیسویں صدی میں یہ تبدیل ہو کر روٹری مشینوں نے لے لی جبکہ اس کی جگہ پر پرانی مشینیں جو کہ زنک پلیٹ کے پتھر کے ذریعے استعمال کی جاتی تھی ان کا استعمال ختم ہو گیا۔ ان ایجادات نے لیتھو لیگی پرنٹنگ کو نستالیگی رسم الخط میں نسبتاً ازاں اور ممکن بنا دیا۔ اس ترقی کی وجہ سے اردو اخبارات کو کثیر تعداد میں چھاپنا اور قابل خرید اب ممکن ہو گیا اور وہ اب "ہر ایک" تک پہنچ سکتا تھا۔ اردو پریس کے لئے اب عام لوگوں تک پہنچنے کا دور آ چکا تھا۔ لیکن اخبارات کو ایسی چٹ پٹی خبریں چاہئے تھیں جو کہ ان کی اشاعت کو بڑھانے کا سبب بن سکے اور "ترکی کے المیے" کا ڈرامہ وہ شدید ضرورت تھی جو کہ ان اخبارات کو چاہئے تھی۔ انھوں نے اس ڈرامے کا بھرپور فائدہ اٹھایا جتنا کہ وہ اٹھا سکتے تھے۔

پہلی جنگ عظیم کے واقعات ہندوستانی مسلمانوں کے لئے شدید صدمہ کا باعث تھے۔ وہ اس ماحول میں پل کر بڑے ہوئے تھے جہاں برطانیہ اور سلطنت عثمانیہ کی دوستی کا تذکرہ معمول کی بات تھی اور اردو پریس میں اس کی بھرپور جھلک دیکھنے کو ملتی تھی۔ اس تناظر میں پہلی جنگ عظیم میں سلطنت عثمانیہ اور برطانیہ کا ایک دوسرے کے مخالف ہونے کی خبریں ان کے لئے شدید پریشانی اور صدمے کا باعث بنیں۔ کسی اور خبر سے زیادہ مولانا محمد علی کا ایک طویل آرٹیکل بالعنوان "ترکوں

کا انتخاب(The Choice of the Turks) ان کے اخبار کامریڈ Comrade میں شایع ہوا۔ اپنے اس مضمون میں برطانیہ سے ترکوں کو لاحق دکھوں اور شکایات کا ذکر کرنے کے بعد انھوں نے اس بات کی امید ظاہر کی کہ ترک اس لڑائی میں غیر جانبدار رہینگے۔ انھوں نے اپنے مضمون کے اختتامیہ میں ہندوستانی مسلمانوں کی حکومت برطانیہ سے وفاداری کا دوبارہ عیادہ کیا۔

ترکی اور جنگ عظیم اول

ترکوں کی طرف سے پہلی جنگ عظیم میں جرمنی اور دیگر طاقتوں کی حمایت تمام لوگوں بالشمول ترکوں کے اپنے لئے بھی باعث حیرت تھی۔ ۱۹۰۸ میں ایک انتہا پسند انتہا پسند (Radical Group)(جسے کمیٹی برائے اتحاد و ترقی (Committee for Union & Progress)(CUP) جسے عمومی طور پر نوجوان ترکی(Young Turks) کہا جاتا ہے۔انھوں نے ایک بغاوت میں خلیفہ عبدالحمید دوئم کو ہٹا کر اقتدار پر قبضہ کرلیا۔اس کی جگہ پر CUP نے خلیفہ کے بھائی محمود رشید کو مسند پر بٹھا کر خلیفہ مقرر کر دیا۔نوجوان ترک(Young Turks) کا اقتدار جلد ہی ایک فوجی مطلق العنانیت(Oilgracy) میں تبدیل ہوگیا۔ پس پردہ اقتدار کے حصول کے لئے تکونی لڑائی جاری تھی جس میں ایک خلیفہ تھے جسے قدامت پسند (conservatives) اور انتہا پسند (Reactionary) عناصر کی حمایت حاصل تھی جبکہ دوسری طرف اعلی نوکر شاہی تھی جنھیں روشن خیال مدد فراہم کر رہے تھے جبکہ تیسری طرف انتہا پسندی اتحادی(Radical Unionist) تھے یعنی نوجوان ترک(۳۱)۔

اندرونی طور پر ترکوں کے حکمران اشرافیہ طبقے میں اختلاف ہونے کے باوجود برطانیہ کے حمایت میں وہ تینوں گروپ متفقہ طور پر اکٹھا تھے۔یعنی ان تینوں کو پچھلی کئی صدیوں سے برطانیہ سے دوستی وراثت میں ملی تھی اور ان کا اس مسئلے میں کوئی اختلاف نہ تھا۔ جہاں تک کے ترک اشرافیہ کا تعلق تھا برطانیہ ان کے لئے سب سے قابل اعتماد اور مستقل دوست تھا۔ تمام فروعی اختلافات کے باوجود ترکی اشرافیہ میں کوئی ایسا گروپ نہ تھا جو کہ برطانیہ کی حمایت نہ کر رہا ہو۔اس صورتحال میں ترکی کا پہلی جنگ عظیم میں اپنے گزشتہ اتحادیوں برطانیہ اور فرانس کے ساتھ طویل دوستی کی روایت سے انحراف کرتے ہوئے وسطی طاقتوں یعنی جرمنی اور آسٹریا ہابسبرگ ریاستوں

کے ساتھ اتحاد بنانا بالکل ایک دلچسپ اور انوکھی بات تھی۔ ابتدائی طور پر ترکی نے خود برطانیہ اور دیگر اتحادیوں کو جنگ میں ان کے ساتھ شریک ہونے اور ان کا اتحادی بننے کی درخواست کی۔ فیروز احمد لکھتے ہیں کہ بالکان کی بھیانک جنگوں میں خارجہ پالیسی کی ناکامی کے بعد CUP کو اس بات کا یقین تھا کہ عثمانی سلطنت کا بچنا صرف اسی صورت میں ممکن تھا کہ وہ جنگ کے ان دونوں بلاکوں میں سے کسی ایک کا اتحادی بن جائے اور ان کی خواہش یہ تھی کہ وہ برطانیہ، فرانس اور روس کے بلاک کا حصہ بنے" اس سلسلے میں ترکی نے اپنے ایلچی برطانیہ، فرانس اور آخر کار روس کے زار نیکولس کے پاس بھی بھیجے۔ ترکی کے یونینسٹ برطانیہ اور فرانس کے حمایتی تھے اور کسی بھی صورت میں جرمنی کے حمایتی بننے کے خواہش مند نہ تھے کیونکہ ان کو یقین تھا کہ ان کے مفادات کا بہتر طور پر برطانیہ اور فرانس ہی تحفظ کر سکتے ہیں۔ لیکن برطانیہ کے ساتھ ترکی کی طویل دوستی اور اتحاد جس میں یقیناً اس کے اپنے مفادات کو بڑا اہم دخل حاصل تھا۔ اس کے باوجود ان مغربی قوتوں نے اپنے اتحاد میں ترکی کے شامل ہونے کی درخواست کو رد کر دیا۔ انھوں نے آخر ایسا کیوں کیا؟

اس بارے میں کچھ اشارے آغا خان کی خودنوشت میں ملتے ہیں جس میں انھوں نے ترکی کے اس فیصلے پر کچھ روشنی ڈالی ہے۔ برطانیہ نے ترکی کی درخواست کو رد کرنے کے ساتھ ساتھ اس بات کی بھی خواہش تھی کہ ترکی کو اس جنگ میں شامل ہونے کی بجائے خود کو غیر جانبدار رکھنا چاہئے۔ آغا خان لکھتے ہیں کہ:

> "لارڈ کچنر Kitchener نے ان سے درخواست کی وہ اپنا اثر و رسوخ استعمال کرتے ہوئے ترکوں کو اس بات پر آمادہ کریں کہ وہ وسطی طاقتوں کا اتحادی بننے کی بجائے اپنی غیر جانبداری کو برقرار رکھے۔ لارڈ کچنر کے ان خیالات کی حمایت اس وقت کے سیکریٹری آف اسٹیٹ برائے انڈیا اور سیکریٹری خارجہ امور سر ایڈورڈ گرے اور برطانوی وزیر اعظم مسٹر Asquith نے بھی کی۔ حد تو یہ ہے کہ ایسے ہی خیالات کا اظہار مجھ سے بادشاہ نے بھی اس موقع پر کئے جب مجھے ان کے ساتھ بعد ازاں ایک ظہرانے میں شریک ہونے کی سعادت حاصل ہوئی (۳۳)"

ان ہدایات کے بعد آغا خان نے لندن میں ترکی کے سفیر اور اپنے پرانے دوست توفیق پاشا سے ملاقات کی اور انھیں برطانوی حکومت کے خیالات سے آگاہ کیا۔ وہ دونوں اس بات سے متفق ہوئے کہ ترکی کو اس جنگ سے دور رہنا چاہئے۔ جوان ترک کو اس بات کی دعوت دی گئی کہ وہ برطانیہ سے براہ راست بات چیت کے لئے لندن اپنے وزراء پر مشتمل ایک وفد بھیجیں۔ آغا کان لکھتے ہیں کہ:

> "برطانیہ نہ صرف خود بلکہ روس کی طرف سے بھی یہ یقین دہانی کرانے کے لئے تیار تھا کہ مستقبل میں ترکی کے تمام مفادات کا خیال رکھا جائیگا۔ آغا خان لکھتے ہیں کہ اس غیر جانبدارانہ رویّے سے کئی فائدے حاصل ہوسکتے تھے ایک تو حالیہ عرصے میں ترکی کو جو نقصانات اٹھانا پڑے تھے جن میں نہ الجھنے کے باعث وہ سماجی ترقی، اقتصادی اصلاحات اور فوجی بہتری کے لئے تن دہی اور پوری توجہ سے کام کرسکتا تھا۔ اس خیال میں عقل مندی پوشیدہ تھی۔

ترکی کے سفیر توفیق پاشا نے اس دوران ترکی کی اپنی حکومت سے رابطہ رکھا اور بعد ازاں آغا خان کو مطلع کیا کہ حکومت ترکی کا خیال یہ ہے کہ زیادہ بہتر یہ ہوگا کہ اگر برطانیہ اور اس کے اتحادی ترکی کو جنگ میں غیر جانبدار رکھنے کی بجائے اس کو اس جنگ میں شریک کرکے اور اس کو اپنا اتحادی بنالیں کیونکہ غیر جانبدار رہنے کی وجہ سے جنگ کے اختتام پر کوئی بھی ملک ترکی کی غیر جانبداری پر اس کا شکر گزار نہ ہوگا لیکن نوجوان ترکوں نے اس بات پر غور نہ کیا کہ ہارنے والی قوتوں کے ساتھ اتحاد بنانے کے بجائے غیر جانبداری شاید اتنا برا سودا نہ ہوتا اور یقیناً وہ جانبداری جو جیتنے والی قوت کے مشوروں پر اختیار کی جارہی ہے۔

یہاں پر ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ برطانیہ نے اپنے اتحاد میں ایک اضافی اتحادی کے شامل ہونے کی درخواست کیوں رد کردیا۔ اس اتحاد میں ترکی کو شریک کرنے کے پس پشت دیگر مسائل میں ایک مسئلہ زار روس کا تھا۔ روس کے ترکی کے خلاف روایتی دشمنانہ رویئے کی وجہ سے اس بات کے قوی امکانات تھے کہ ترکی کو اتحاد میں شامل کرنے کی وجہ سے روس اس اتحاد سے الگ ہوجاتا جس کے باعث برطانیہ کو جرمنی جیسی ابھرتی ہوئی طاقت کا تنہا مقابلہ کرنا پڑا۔ یہی وجہ تھی

جس کی وجہ سے برطانیہ کوئی رسک لینے کو تیار نہ تھا۔ توفیق پاشا کا بھی یہی خیال تھا کہ روس کسی بھی صورت میں اس اتحاد میں ترکی کے شامل ہونے کو آسانی سے قبول نہیں کریگا کیونکہ اس طرح ترکی کے علاقوں میں روس کی توسیع پسندی کے تمام منصوبے خاک میں مل جاتے۔ ان حالات میں برطانیہ کے پاس اس کے علاوہ کوئی اور راستہ نہ تھا کہ وہ ترکی کی طرف سے فراغ دلی کے ساتھ جنگ لڑنے کی پیشکش کو ٹھکرا دے۔ ترکی کو اس اتحاد میں شامل کرنے کا مطلب روس سے دشمنی مول لینا تھا اور اس طرح برطانیہ کو روس کے غیر جانبدار بن جانے کے بعد تنہا جرمنی سے مقابلہ کرنا پڑتا جو کہ اس کے لئے بڑا مشکل ہوتا۔

برطانیہ نے عثمانیوں کی متواتر درخواستوں کو باوجود بڑی نرمی سے مسترد کر دیا۔ اس کے نتیجے میں ترکی کی حکومت نے ابتدائی طور پر "انتظار اور دیکھو" کی پالیسی کا طریقہ اپنایا نہ کہ وہ فوری طور پر جرمنی کا اتحادی بننے کا فیصلہ کیا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہی انھوں نے بڑی سمجھداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے جرمنوں کے خلاف بھی کسی طرح کی دشمنانہ (Hostilites) سے بچنے کی کوشش کی۔ اس طرح وہ اپنے تمام راستے کھلے رکھنا چاہتے تھے۔ اسی دوران جبکہ ترکی میں اس موضوع پر غور وفکر چل رہا تھا کہ انھیں کسی اور فریق کا ساتھ دینا چاہئے یا غیر جانبدار رہنا چاہئے، اکتوبر ۱۹۱۴ میں ترکوں نے یورپ کی ایک بڑی جنگ میں شریک ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ آغا خان لکھتے ہیں کی ۱۹۱۴ کے اختتام تک وسطی طاقتوں کو یقین تھا کہ وہ جلد ہی اپنی شرائط وضوابط پر کامیابی کر لیں گی۔ بدقسمتی سے وسطی قوتوں کے ان دعوؤں، خود اعتمادی اور خوش فہمیوں سے متاثر ہو کر ترکی نے ایک نا قابل واپسی قدم اس وقت اٹھایا جب اس نے روس کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ ترکی کی سلطنت کے اس اقدام نے قدرتی طور پر اسے برطانیہ اور فرانس سے بھی جنگ میں الجھا دیا۔ اگر ترکی کے اس قدم کو دیکھا جائے کہ تو یہ بات واضح ہوگی کہ ترکوں نے یہ قدم اٹھا کر اپنے آپ کو بہت بڑی تباہی میں مبتلا کر دیا۔ یہ ایک ایسا فیصلہ تھا جس میں منطق کا کوئی دخل نہ تھا۔ اس جنگ میں ترکی کے لئے غیر جانبدار رہنا ایک انتہائی عقل مندی کا فیصلہ ہوتا۔

خلیفہ بعد از جنگ اول

نوجوان ترک (CUP) کے رہنما جنھوں نے ترکی کو اس خطرناک جنگ میں دھکیلا تھا بعد از

جنگ ایک جرمن بحری جنگی جہاز میں بیٹھ کر فرار کا راستہ اپنا لیا۔ بعد ازاں ترکی کے نظام حکومت میں بڑے پیمانے پر اتھل پتھل کی گئی اور ۳۰ اکتوبر کو جنگ بندی کے معاہدے پر دستخط کئے گئے۔ جولائی ۱۹۱۸ میں CUP کے رہنماؤں کے نامزد کردہ جنگی خلیفہ محمد رشید کو اقتدار سے الگ کر کے اس کی جگہ محمد ولی الدین کو نیا خلیفہ مقرر کر دیا گیا۔ برطانیہ کے دوست ایک مرتبہ پھر صاحب اقتدار ہو گئے۔ اسکن (Askin) کے مطابق مارچ ۱۹۱۹ میں ترکی کے وزیر اعظم فرید پاشا نے برطانوی حکومت کو ایک فوری پیغام بھیجا جس میں اس نے لکھا کہ:

"ان کی تمام امیدیں خدا اور اس کے بعد برطانوی حکومت سے وابستہ ہیں اور انھیں اپنی حکومت چلانے کے لئے مالی امداد کی ضرورت ہے اور یہ کہ وہ ہر اس شخص کو گرفتار کرنے کے لئے تیار تھے جو کہ برطانیہ کو مطلوب ہو" (۳۸)

جنگ کے دوران برطانیہ نے ترکی کے خلاف اپنے تمام پروپگنڈہ کا حدف جوان ترکوں (CUP) کو بنایا تھا اور خلیفہ کے خلاف کوئی بات نہ کہی گئی کیونکہ انھیں یقین تھا کہ انھیں جنگ کے بعد خلیفہ سے تعلقات کی بحالی کے لئے کوئی راستہ کھولنا ہوگا اس لئے اسے تنقید کا نشانہ نہ بنایا جائے۔ خلیفہ کو اس پروپگنڈے میں نہ الجھانے کے پس پشت برطانیہ کی تین وجوہات شامل تھیں۔ اوّل تو یہ کہ انھیں معلوم تھا کہ خلیفہ صرف نمائشی حکمران تھے اور اصل قوت نوجوان ترکوں (CUP) لیڈروں کے پاس ہی تھی۔ دوسرا یہ کہ برطانیہ کو یقین تھا کہ خلیفہ اور ترکی کے پرانے حکمران طبقوں کی ہمدردی مکمل طور پر برطانیہ کے ساتھ تھی اور وہ ہمیشہ ان کے ساتھ ہی رہے گی۔ برطانیہ کو یہ بات بھی معلوم تھی کہ خلیفہ کو اس بات کا یقین تھا کہ سلطنت عثمانیہ کا سب سے بڑا محافظ خود برطانیہ تھا۔ تیسرا یہ کہ برطانیہ کو اس بات کا اب بھی یقین تھا کہ خلیفہ کے تمام عالم اسلام کے سربراہ ہونے کے دعوے کو مناسب وقت پر اپنے حق میں استعمال کر سکتا تھا جس طرح ماضی میں وہ کرتا آیا تھا۔ خلیفہ ماضی میں بھی برطانیہ کے لئے قیمتی اثاثہ رہا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ مستقبل میں بھی اس اثاثے کو اپنے حق ہی میں رکھے۔

جنگ کے اختتام پر نوجوان ترکوں کے سربراہوں کی فرار کے ذریعے اختیار کی جانے والی خود ساختہ جلاوطنی کے باعث ترکی میں طاقت کا ایک خلا پیدا ہو گیا۔ اس خلاء کو ترکی کے پرانے

روایتی حکمران طبقے نے خلیفہ کے ساتھ مل کر بھرا۔ یہ صورت حال برطانیہ کی خواہش کے عین مطابق تھی۔ اب ان کا مرہون منت گروپ دوبارہ صاحب اقتدار تھا۔ ہندوستان کے خلافتیوں کے تمام دعوؤں کے باوجود حقیقت یہ ہے کہ جنگ کے بعد برطانیہ اس بات پر مکمل طور پر کاربند تھا کہ وہ خلافت کے ادارے اور خلیفہ کو نہ صرف مستحکم رکھے بلکہ ملک کے اندرونی اور بیرونی معاملات پر خلیفہ کے اختیار کو دوبارہ بحال کرایا جائے۔ برطانیہ کو نمائشی خلیفہ کا دشمن ہونے کا مورد الزام ٹھہرا کر ہندوستانی خلافتی درحقیقت ایک خیالی دشمن سے لڑائی کر رہے تھے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ خلیفہ کو اصل خطرہ برطانیہ سے نہیں بلکہ طاقتور ترکی کے عوامی قوم پرستوں کی طرف سے تھا جو کہ سیکولر اور جمہوریت کے خواہش مند تھے۔ جبکہ اصل صورتحال یہ ہے کہ خلافتی اس قابل ہی نہ تھے کہ وہ ترکی کے اندر مطلق العنان خلیفہ اور جمہوری خیالات رکھنے والے عوامی نیشنلسٹوں کے تاریخی تصادم کو سمجھ سکیں۔ خلافتیوں کی تضادی سوچ اور ان کی الجھنوں کی صورتحال یہ تھی کہ ایک وقت میں انھوں نے مصطفیٰ کمال کو غازی پکارنا شروع کر دیا۔ جبکہ اسی وقت انہوں نے قابل احترام (venerated) خلیفہ کے کردار کو بھی بڑھا چڑھا کر بیان کرنے کی کوشش کی۔ انھیں اس بات کا اندازہ ہی نہ تھا کہ یہ دونوں قوتیں ترکی کے معاشرے اور سیاست میں ایک دوسرے کے شدید مخالف عناصر تھے۔ خلافتیوں کی طرف سے اس صورتحال کو سمجھنے میں ناکامی ایک ناقابل یقین بات ہے۔

انتولیا (Anatolia) میں ترکی کی ایک نئی ریاست ابھر کر سامنے آ رہی تھی۔ یہ نئی قیادت ان افراد پر مشتمل تھی جنھوں نے معاہدہ سورس (Treaty of Sevres) کو مکمل طور پر مسترد کر دیا تھا اور ان تمام شرائط کو بھی جو کہ اسی کے ساتھ منسلک تھیں۔ اس نئی قیادت نے ان تمام ترکوں کو غدار کہنا شروع کر دیا جنھوں نے اس معاہدے کو تسلیم کر لیا تھا۔ ہندوستانی خلافتیوں نے ترکی کے ساتھ معاہدہ سیورس میں ہونے والی زیادتیوں پر مگرمچھ کے آنسو بہائے۔ لیکن انھیں یہ بات پتا نہ چلی کہ ان زیادتیوں کے ازالے کے لئے ان کے "محبوب خلیفہ" نے تو کچھ نہ کیا اور خاموشی سادھ لی لیکن ان شرائط کے خلاف کامیاب احتجاج تو عوامی قوم پرستوں نے بلند کیا۔ یہ خلافتی "خلیفہ کی تقدیر" کے رونے دھونے میں اس قدر الجھ گئے کہ وہ ترکی میں نئی ابھرنے والی حقیقتوں کو سمجھ ہی نا سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ نمائشی (Supine) خلیفہ نے تو معاہدہ سورس کی وہ تمام کڑی شرائط جو

کہ Lloyd George کے متعصبانہ رویوں کی وجہ سے عائد کی گئی تھیں انھیں خاموشی سے تسلیم کر لیا تھا لیکن قابل ستائش ہیں وہ قوم پرست کہ جن کی جدوجہد کے نتیجے میں معاہدہ سورس ایک مردہ دستاویز بن گئی اور قوم پرستوں نے جنگ عظیم کی فاتح اقوام کے ساتھ دوبارہ ایک نیا اور باعزت معاہدہ لائسنے (Lausanne) کے مقام پر ۲۰ نومبر ۱۹۲۲ میں ہونیوالی ایک امن کانفرنس میں طئے کیا۔ لارڈ کرزن کے الفاظ میں (جسے "مولانا" محمد علی نے بھی رقم کیا ہے) معاہدۂ سورس وہ ظالمانہ شرائط تھیں جو کہ فاتح اتحادیوں نے ایک شکست خوردہ قوم پر بندوق کی نوک پر زبردستی تھوپی تھیں۔ یہ شرائط ایسے فیصلوں پر مشتمل تھیں کہ جب کسی مجرم کو گرفتاری کے بعد اس کے جرم کی اپنی خواہش کے مطابق سزا سنادی جائے جبکہ لائسنے میں ترکوں نے مذاکرات میں برابری کی بنیاد پر جنگ کے دیگر اتحادیوں سے بات چیت کی (۳۹)

خلیفہ کے خلاف برطانوی سازشیں

۹ نومبر ۱۹۱۸ کو جب خلیفہ اور اس کے درباریوں نے دوبارہ اقتدار سنبھال لیا تو استنبول میں برطانیہ کے نئے مقرر شدہ سفیر کلتھورپے (Calthorpe) نے برطانوی وزیر خارجہ لارڈ بیلفور (Lord Balfour) کو لکھا:

> "ترکی کے وزراء اپنے آپ کو برطانیہ کے حقیقی دوست ثابت کرنے کی کوشش کرینگے اور آپ کی ہمدردیاں جیتنے کی کوشش بھی جاری رکھے گے (۴۰)"

اس نے اپنے خط میں اپنی حکومت کو مزید لکھا کہ خلیفہ تمام مسلم دنیا کے حوالے سے ایک انتہائی اہم کردار ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ترکی کے اپنے لئے بھی۔ اس نے اپنے خط میں مزید لکھا کہ خلیفہ کی یہ خواہش ہے کہ برطانیہ ترکی سے اپنے تعلقات دوبارہ پوری طرح بحال کرلے (۴۱)

برطانیہ کی حمایت سے خلیفہ کی حکومت نے نوجوان ترکوں اور اس کے بعد ابھر کر سامنے آنے والی عوامی قوم پرستوں کی قوت سے ٹکر لینے کا فیصلہ کیا۔ اب ترک سلطان اور اس کے وزیروں کے لئے سب سے اہم کام بچے کچے نوجوان قوم پرست ترکوں کا خاتمہ تھا (۴۲)۔ اسی سلسلے میں نئی عوامی قوم پرست تحریک کو جو کہ مصطفیٰ کمال کی زیر قیادت کام کر رہی تھی اسے فیصلہ کن انداز میں

دبانے کی کوشش شروع کی گئی۔ برطانیہ اور سلطان کے ہمدردوں کا خیال تھا کہ قوم پرست ان کے خلاف کاروائی کرنے کے لئے اکٹھا ہو رہے تھے۔ جولائی ۱۹۱۹ میں مصطفیٰ کمال نے کانگریس کے اجلاس میں شرکت کے لئے تمام اضلاع سے وفود طلب کئے جنھوں نے مل کر عظیم قومی عوامی اسمبلی (Popular Grand National Assembly)(کی بنیاد رکھی جس نے اپریل ۱۹۲۰ میں اپنا کام شروع کیا اور اسی نے ترکی کو موروثی نظام سے آزادی دلانے کی کوشش کی۔ اس صورت حال کے باعث اتحادیوں اور ان کے پٹھو خلیفہ کے کان کھڑے ہو گئے۔ اگست ۱۹۱۹ میں ایک اعلامیہ "ملّی میثاق (Milli Misak) یا قومی معاہدہ (National pact) جاری کیا گیا۔ ستمبر میں دوسری عوامی قومی اسمبلی کی کانگریس میں مصطفیٰ کمال کو اس کا چیئر میں مقرر کیا گیا۔ اس طرح قومی جدوجہد حقیقی اور درست سمت میں شروع ہو گئی۔

برطانیہ نے اپنے دوست خلیفہ کو جو کہ انھیں بڑے عرصے سے مدد کے لئے پکار رہا تھا اسے قوم پرستوں کے ممکنہ انقلاب اور اقتدار سے محروم کئے جانے سے بچانے کے لئے بالآخر اپنی فوجیں ۶ مارچ ۱۹۲۰ کو استنبول میں داخل کر دیں۔ واضح رہے کہ یہ فوجیں جنگ عظیم اول کے ختم ہونے اور خلیفہ کے دوبارہ بحال کئے جانے کے ۱۸ ماہ بعد بھیجی گئیں تھی جبکہ خلیفہ اس سے قبل ہی کے بعد دوبارہ اقتدار میں بحال ہو چکا تھا اور قوم پرستوں کے خلاف بڑی بھرپور کاروائی میں مصروف تھا۔ دیگر موقع اور مفاد پرست ملاؤں کی طرح اس بار بھی شیخ الاسلام درزادے عبداللہ آفندی نے وزیراعظم داماد فرید پاشا کی درخواست پر اپنی پرانی روایات کے عین مطابق خلیفہ کی حمایت اور قوم پرستوں کی قومی جدوجہد کے خلاف فتوی صادر کرتے ہوئے یہ کہا کہ قوم پرستوں کو قتل کرنا تمام مسلمانوں کے لئے مذہبی ذمہ داری میں شامل ہے۔ اسی فتوے کا ہدف مصطفیٰ کمال خود بھی تھے جن کے خلاف پہلے ہی خلیفہ کی ایک عدالت موت کا پروان جاری کر چکی تھی۔ ہندوستانی خلافتی جو کہ بیک وقت جہاں ایک طرف خلیفہ کی حمایت کر رہے تھے تو دوسری طرف مصطفیٰ کمال کے کردار کو ہیرو کے طور پر پیش کر رہے تھے۔ اس نئی صورتحال میں انھوں نے چپ سادھ لی ترکی کی فوج نے قوم پرستوں کے بڑھتے ہوئے اثرات کو دیکھتے ہوئے خلیفہ پر مزید یقین کرنا درست نہ سمجھا۔ خلیفہ نے فوج کا رویہ دیکھتے ہوئے فوجوں سے ہتھیار واپس لینا شروع کر دئے۔ خلیفہ کے خلاف کسی بھی عوامی بغاوت کو روکنے کے لئے برطانیہ کی مدد سے ایک

خصوصی فورس "قوت برائے نظم اور کنٹرول"(quwwaindibatiye) ترتیب دی گئی جس کا مقصد قوم پرستوں سے مقابلہ کرنا تھا لیکن اس کے برعکس قوم پرست مضبوط سے مضبوط تر ہوتے چلے گئے۔

مصطفیٰ کمال "برطانیہ کے دوستوں" کے حوالے سے

قوم پرستوں کے شدید دباؤ کے باعث خلیفہ کو اپنے اقتدار کو بچانے کے لئے برطانیہ کی طرف رجوع کرنا پڑا۔ مصطفیٰ کمال نے اکتوبر ۱۹۲۷ میں اپنی مشہور زمانہ تقریر (چھ روزہ تقریر) 6 day speech میں انجمن برائے دوستگان برطانیہ (Society of friends of England) کے متعلق اظہار خیال کیا۔ اس نے اپنی تقریر میں کہا کہ یہ انجمن کچھ بھٹکے ہوئے لوگوں نے بنائی تھی۔ اس نے مزید کہا کہ "اس انجمن کی سربراہی میں وہ وحدتی (Vahdettin) شامل تھے جن کے القابات میں عثمانی سلطان اور خلیفہ، دامت فرید پاشا (وزیر اعظم)، علی کمال، وزیر داخلہ جیسے لوگ شامل تھے...." (کمال نے انجمن کے دیگر سرکردہ رہنماؤں کے نام بھی لئے جن کا تعلق گزشتہ حکومت سے تھا)۔ کمال نے انجمن پر یہ الزام بھی لگایا کہ "انجمن نے کھے عام انگلستان کی پناہ اور مدد چاہی اور اس نے خفیہ طور پر عوام کو قوم پرستوں کے خلاف کھڑا کرنے کی کوشش کی تاکہ ملک میں افراتفری پیدا کر کے بیرونی مداخلت کو موقع فراہم کیا جا سکے" (۴۵)۔

مصطفیٰ کمال نے واضح الفاظ میں یہ بات کہی کہ اس حالت میں جبکہ قوم کو کوئی رہنمائی فراہم کرنے والا نہ تھا اور بادشاہ اپنے تمام وسائل کے ساتھ سازشوں میں مصروف تھا اور یہ صورتحال ملک کے لئے تباہ کن ہو سکتی تھی ان حالات کو دیکھتے ہوئے ہمیں اندازہ ہو گیا کہ اگر ملک کو بچانا ہے تو خلافت کے پرانے نظام کو ختم کرنا ہوگا اس نے مزید کہا کہ ملک کے مذہبی پیشوا مذہب کا نام استعمال کرتے ہوئے صدیوں سے خلیفہ کے اقتدار کو بچانے کے لئے تمام حربے استعمال کرتے رہے تھے۔ اس لئے اب اس کے بھی خاتمے کی شدید ضرورت تھی۔ ہمیں مجبور کیا گیا کہ ہم عثمانی حکومت، بادشاہ اور خلیفہ کے خلاف بغاوت کریں اور عوام اور فوج کو اپنے ساتھ ملا بغاوت کر دیں (۴۹)۔ مصطفیٰ کمال نے یہ بات بھی واضح کی کہ انھوں نے خلافت کے نظام سے چھٹکارا حاصل کرنے کا فیصلہ تو عوامی انقلاب کے ابتدائی دنوں میں ہی کر لیا تھا لیکن لڑائی کی

حکمت عملی کی ضرورت یہ تھی کہ صورتحال کو اپنے حق میں تبدیل کرتے ہوئے خلافت کا آہستہ آہستہ خاتمہ کیا جائے۔ حد تو یہ ہے کہ اپنے قریبی ساتھیوں کو بھی اپنے خیالات سے آگاہ نہ کیا کیونکہ ہر فیصلے کا اعلان مناسب وقت پر ہی کیا جانا ہی بہتر ہوتا ہے اور یہ موقع بالآخر ۱۹۲۴ میں آیا (۵۰)۔

مصطفیٰ کمال کے اس بیان سے تو یہ بات بالکل عیاں تھی کہ خلیفہ برطانیہ اور دیگر یورپی طاقتوں کے ساتھ خفیہ سازشوں میں ملوث تھے۔ برطانیوں نے خلیفہ کو ترکی کے قوم پرستوں کے خلاف ڈھال کے طور پر استعمال کرنے کی کوشش کی۔ برطانیوں کا مفاد اسی میں تھا کہ وہ قوم پرستوں کے مقابل خلیفہ کو ترکی کی ریاست میں مرکزی مقام پر فائز رکھیں۔ برطانیہ کی اس روایتی پالیسی کو وقتی طور پر رخنے کا سامنہ جنگ عظیم کی مخلوط حکومت اور خصوصاً لارڈ جارج Lloyd (George*) اور اسکویتھ (Asquith*) کی ترک مخالف اور یونان کے لئے حمایت کی پالیسیوں کے باعث آیا۔ یہ دونوں وہ لوگ تھے جو کہ اس وقت جنگ کے دوران برطانیہ کی مخلوط حکومت کی سربراہی کر رہے تھے اور انہیں جنگ کے فوراً بعد اقتدار سے محروم ہونا پڑا اور ان کی جگہ قدامت پرستوں (Conservative) کی حکومت بونر لاء کی سربراہی میں بن گئی۔ بونر حکومت کے انتظام سنبھالنے کے بعد برطانیہ نے اپنی ترکی اور خلیفہ کی حمایت کی روایتی پالیسیوں کا دوبارہ اجراء کر دیا لیکن کچھ نئی تبدیلیوں کے ساتھ اس بدلی ہوئی صورتحال میں جسے برطانیہ نے فرانس کے ساتھ مل کر تشکیل دیا تھا اس کے تحت ترکی کو اس کے عرب کی نوآبادیاتی سے محروم کرتے ہوئے عرب کے ان علاقوں کو آپس میں تقسیم کر لیا۔

عرب کا علاقہ اور برطانیہ کی علاقے کے بارے میں ترجیحات میں تبدیلی

برطانیہ اب تک اس بات کا خواہش مند تھا کہ وہ اپنے دوست عثمانی خلیفہ کو ترکی میں حکمران کے طور پر برقرار رکھوائے۔ لیکن جنگ برطانیہ کی عثمانیوں کے لئے روایتی حمایت کی پالیسی میں چند تاریخی وجوہات کی بناء پر تبدیلی لے آئی تھی۔ برطانیہ کے ترکی سے صدیوں کے دوستانہ روابط زار روس کے توسیع پسندانہ عزائم کے پیش نظر تھے۔ جنگ عظیم اوّل سے قبل تک عثمانی ترکی روس کے جنوب کی طرف بڑھنے کے عزائم میں سب سے بڑی دیوار تھا۔ ۱۹۱۷ کے روس کے

کمیونسٹ انقلاب نے سارے علاقے کے نقشے میں بنیادی تبدیلیاں کردی تھیں۔ اب اس علاقے کے بارے میں نئے نقشے اور نئی منصوبہ بندیاں سامنے آگئی تھیں۔ سوویت یونین کی نئی قیادت نے اقتدار حاصل کرنے کے بعد اپنی ہمسایہ ریاستوں کے ساتھ زار کے دور میں کئے گئے غیر مساوی معاہدوں کو فوری طور پر ختم کرنے کا اعلان کیا۔ انھوں نے اپنے اعلان میں جنوب کی طرف توسیع پسندی کے عزائم کو مزید جاری رکھنے کا کوئی عندیہ نہ دیا اور حقیقت تو یہ ہے کہ ان کے پاس ایسا کرنے کی صلاحیت بھی نہ تھی اور نہ ہی ان کی ایسی کوئی خواہش تھی۔ اس نئی صورتحال میں اب برطانیہ کو کسی مضبوط عثمانی سلطنت کی ضرورت نہ رہی جو کہ طاقتور روس کا سامنہ کرنے کے قابل ہو جو کہ اب تک ان کی ضرورت رہی تھی۔ اس کی ترجیحات اب مکمل طور پر بدل چکی تھیں۔

برطانیہ اور فرانس نے جنگ کے اختتام پر نئی جغرافیائی صورتحال کے تحت سلطنت عثمانیہ کے عرب علاقوں کو اپنی نوآبادیاتی بناتے ہوئے انہیں آپس میں تقسیم کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ لیکن اس وقت تک عربوں کی قومی جدوجہد کی تحریکیں اپنا وجود ثابت کر چکی تھیں اور ان کی واضح شکل سامنے آچکی تھی۔ اب عربوں کی خواہش تمام نوآبادیاتی حکمرانوں سے نجات حاصل کرنا تھی۔ جبکہ ترکی کے نئے قوم پرست بھی عثمانی خلیفہ کی طرح عرب علاقوں پر اپنے نوآبادیاتی تسلط کو ہر قیمت پر برقرار رکھنے کے خواہش مند تھے۔ ہندوستانی خلافتیوں نے ترکوں کے ان دعووں سے متاثر ہو کر ترکوں کے عرب پر تسلط کی حمایت کرنا شروع کردی جو کہ اصولی طور پر عربوں کے حق خودارادیت کی قومی جدوجہد سے انکار کے مترادف تھا۔ جبکہ دوسری طرف عرب کے علاقے پہلے ہی برطانیہ اور فرانس کے زیر تسلط آچکے تھے۔ ہندوستان کے خلافتیوں نے عرب علاقوں کو آزادی دینے کے بجائے انھیں دوبارہ ترکی کے حوالے کرنے کا نعرہ بلند کرنا شروع کیا جو کہ درحقیقت عرب علاقوں پر ترکی کے دوبارہ نوآبادیاتی تسلط کو بحال کرنے کے مترادف تھا۔ خلافتیوں نے اپنے نعروں کے پس پشت یہ منطق بیان کی گئی کہ مسلمانوں کے مقام مقدسہ صرف مسلمان حکمران کے زیر اثر رہنا چاہئے۔ حالانکہ عرب بھی مسلمان تھے اور خلافتیوں کا عربوں کے ان کی آزادی کی جدوجہد میں ساتھ دینے کی بجائے ترکی کی حمایت کرنا ایک قابل مزاحمت بات تھی۔ ہندوستانی خلافتی جو کہ اپنے آپ کو ہندوستانی قوم پرست کہلوانے پر فخر محسوس کرتے تھے ان کا عرب قوم پرستوں کے لئے یہ رویہ نہایت شرم ناک بات تھی۔ لیکن ان کے اس رویئے میں کوئی حیرت انگیز بات نہ تھی کیونکہ

خلافت تحریک کی سربراہی جاہل اور دقیانوسی مسلمان Clergy اور بنیاد پرست علماء جن میں مولانا آزاد بھی شامل تھے وہ کر رہی تھی۔

ہندوستانی خلافتیوں نے عرب قوم پرستوں کی قومی جدوجہد کی تحریک کو جھٹلا کر عرب قوم پرست سے دھوکا (Betrayal) کیا۔ اس کے ساتھ ہی ہندوستانی خلافتیوں کا خود ترکی میں خلافت کی بحالی پر اصرار درحقیقت رجعت پسندی کے نظام کو دوبارہ بحال کرنے کے مترادف تھا۔ خلیفہ کی حمایت کر کے درحقیقت وہ ابھرتی ہوئی عوامی جمہوریت کی حمایت کرنے کی بجائے دقیانوسی اور Outmoded بادشاہت کی حمایت کر رہے تھے۔ یہ تحریک جہالت، تعصب اور احمقانہ سوچ پر مشتمل تھی جو کہ حقیقت سے آنکھیں چرا کر دوبارہ خلیفہ کے کردار کو بحیثیت مذہبی سربراہ کے بڑھاوا دینے کی خواہش مند تھی۔ ان کا عثمانی خلیفہ کی طرف یہ رویہ تاریخ کو توڑ مروڑ کر اور اس کو تنگ نظری سے دیکھنے کی وجہ سے سامنے آیا تھا اور اس صورتحال کے ذمہ دار آزاد سمیت دیگر تمام دقیانوسی علماء اور کلرجی (Clergy) کے افراد تھے۔

خلیفہ بطور برطانوی قیدی

ہندوستانی خلافتیوں نے اپنی تحریک کی بنیاد اس بات الزام پر رکھی تھی کہ برطانیہ نے جنگ کے اختتام پر خلیفہ کو "قید" کر دیا جس کے باعث اس کے اختیارات اور اس کے اپنے وجود کو شدید خطرات لاحق ہو گئے تھے۔ جبکہ ہم جانتے ہیں کہ حقیقت اس کے بالکل برعکس تھی۔ حقیقی صورتحال یہ تھی کہ خلیفہ کو اصل خطرہ ترکی کے ابھرتے ہوئے عوامی قوم پرستوں کی طرف سے تھا۔ جبکہ دوسری طرف برطانیہ مکمل طور پر خلیفہ کا حمایتی اور اس کا سرپرست تھا اور وہ بھی خلیفہ کی طرح قوم پرستوں کی بڑھتی ہوئی مقبولیت اور عوامی تائید سے سخت خوفزدہ تھا۔ اس مرحلے پر اہم سوال یہ ہے کہ ہندوستانی خلافتی کس طرح ترکی کی صورتحال پر ایک غلط نتیجے پر پہنچے؟

ترکوں کی عوامی قومی تحریک خلیفہ کے لئے براہ راست خطرہ تھی کیونکہ ان کی خواہش تھی کہ ترکی سے خلافت کا خاتمہ کر کے موروثی اقتدار کے نظام کا خاتمہ کیا جائے۔ جبکہ اس کے مقابلے میں برطانیہ کی یہ خواہش تھی کہ خلافتی نظام کو ترکی میں جاری رکھا جائے۔ برطانیہ اور خلیفہ نے ترکی میں عوامی قوم پرستوں کے خطرے کو بیک وقت مل کر سامنا کیا۔ خلیفہ کے پاس صرف ایک ہی

ہتھیار تھا جو کہ وہ عوامی قوم پرستوں کے خلاف استعمال کر سکتا تھا اور وہ تھا اسلامی نظریہ Islamic (Ideology) کا تحفظ جس کا کہ وہ اپنے آپ کو یقیناً نگراں (Guardian) تصور کرتا تھا۔ خلیفہ نے مذہبی پتہ (card) کھیلنے کی کوشش کی جو کہ یقیناً ایک بڑا اس قیمتی پتہ تھا۔ اس نے عوامی قوم پرستوں کو دہریئے اور خدا اور اس کے خلیفہ کا دشمن قرار دینے کا اعلان کیا۔ اسکو امید تھی کہ اس کے اس اعلان کے بعد ترکی کے لوگ ان عوامی قوم پرست رہنماؤں سے بدزن ہو کر اس کی حمایت شروع کر دینگے۔

جب کہ دوسری طرف عوامی قوم پرست اپنی تمام تر تیز رفتار ترقی اور عوامی مقبولیت کے باوجود اب تک اپنی بڑی کامیابیوں کے ابتدائی مراحل میں تھے۔ انھیں خلیفہ کے پروپیگنڈہ سے خطرات محسوس ہونا شروع ہوئے۔ انھیں اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ وہ اس مہم کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ مصطفیٰ کمال کی تقریروں سے یہ بات واضح تھی کہ انھیں اندازہ تھا کہ اسلامی نظریہ بندی (Islamic Ideology) کو اب بھی ایک اہم طاقتور عنصر کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے اور خلیفہ اپنے پروپیگنڈہ کے ذریعے ان کے مقصد کو نقصان پہنچا سکتا تھا۔ فیروز احمد لکھتے ہیں کہ ترکی کے قوم پرستوں نے بڑی جدوجہد کے بعد خلیفہ کے مذہبی پروپیگنڈہ کو کنٹرول کرنے کی کوشش تھی کیونکہ انھیں مظلوم تھا کہ ترکی کے معاشرے میں اسلام کا گہرا اثر تھا۔ ترکی کے قوم پرستوں کے لئے یہ کام درحقیقت اس وقت آسان ہوا جب استنبول پر برطانیہ اور فرانس کی فوجوں نے مشترکہ طور پر قبضہ کر لیا۔ اب قوم پرستوں نے خلیفہ اور ترک سلطان کو عیسائی طاقتوں کے قیدی کے طور پر پکارنا شروع کر دیا جس کی آزادی کی شدید ضرورت تھی۔ برطانیہ اور فرانس کی فوجیں استنبول میں جنگ عظیم اول کے خاتمہ کے ۱۸ مہینے بعد ۱۶ مارچ ۱۹۲۰ کو داخل ہوئیں جبکہ خلیفہ اس وقت مکمل طور پر اقتدار پر اپنا قبضہ جما چکا تھا۔ عوامی قوم پرستوں کو اپنے (Counter Propaganda) پروپیگنڈے کے لئے بے شک کوئی مضبوط بنیادیں تو حاصل نہ تھیں لیکن درحقیقت یہ ایک نظریاتی جنگ تھی اور اس جنگ میں کسی بھی قسم کے ہتھیار کا استعمال خوش آئندہ تھا۔ برطانوی فوجیں استنبول میں وقت داخل ہوئیں جب عوامی قوم پرست اپنے لئے میدان ہموار کر رہے تھے۔ اس لئے اس بات کا قوی خطرہ موجود تھا جو یقیناً بلا جواز بھی نہ تھا کہ خلیفہ کے خلاف عوامی بغاوت ہو سکتی ہے۔

عوامی قوم پرست اسی لئے ہی تو لڑ رہے تھے جبکہ برطانیہ ہر صورت میں خلیفہ کو تحفظ فراہم

کرنا چاہتا تھا کیونکہ وہ ان کا حلیف تھا۔ اگر برطانیہ واقعی خلیفہ کو "قیدی" بنانے کا خواہش مند ہوتا تو استنبول میں فوجیں ۱۸ ماہ بعد نہ بھیجتا بلکہ ڈیڑھ سال قبل بھیج چکا ہوتا جبکہ ترکی جنگ کے نتیجے میں شکست خوردہ تھا۔

اس صورتحال میں جبکہ ترکی کے عوام عوامی قوم پرستوں کے اس دفاعی پروپگنڈہ کے بارے میں جو کہ انہوں نے شروع کر رکھا تھا جس میں یہ دعوی کیا گیا تھا کہ خلیفہ برطانیہ کا قیدی بن چکا ہے، ایک اپنا نکتہ نظر بنا رہے تھے تو دوسری طرف ہندوستانی خلافتیوں نے اس تحریک کو گہرائی میں دیکھنے کی بجائے صرف ظاہری صورتحال کو دیکھتے ہوئے اپنے مطالبات خلیفہ کی بحالی تک محدود کر دیا۔ ہندوستان کی خلافت تحریک کے لئے خلیفہ کی برطانوی قید سے آزادی ان کا مطمہ نظر بن گیا۔ دنیا دار عقلمند ہندوستانی مسلمان لیڈر اس بات کو تسلیم کے لئے تیار ہی نہ تھے کہ خلیفہ بھی برطانیہ کے ساتھ مل کر اپنے ہی ملک کی قوم پرست عوامی تحریکوں کے خلاف سازش میں ملوث ہو سکتا تھا۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ مغربی طاقتوں اور خلیفہ کے مشترکہ مفادات اس میں پنہا تھے کہ وہ مل کر ترک عوام کی تحریک کو کچل دیں۔ اس بات کے شواہد حاصل کرنا ہندوستان کے خلافتی رہنماؤں کے لئے کوئی مشکل بات نہ تھی۔ ان کے لئے یہ بڑا ہی آسان کام تھا۔ اس کا سہل حل یہ تھا کہ وہ ایک وفد خود استنبول بھیج دیتے جو کہ وہاں کے حالات کو اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر لیتا۔ اس کے ساتھ ساتھ ان لوگوں کے استنبول میں مختلف لوگوں کے ساتھ بڑے گہرے ذاتی مراسم پہلے سے ہی موجود تھے۔ اس طرح اس معاملے کی اصل حقیقت کی تہہ تک پہنچنے میں کوئی مشکل نہ ہوتی لیکن انھوں نے ایسی کوئی کوشش ہی کی۔ اس صورتحال میں ان شکوک وشبہات کا پیدا ہونا بالکل صحیح لگتا ہے کہ درحقیقت دانستہ طور پر اس معاملے کی تہہ تک پہنچنے کے خواہش مند ہی نہ تھے کیونکہ اس صورت حال سامنے آنے کی صورت میں ان کے اس غبارے سے ہوا ہی نکل جاتی جس کی بنیاد پر وہ تحریک چلانے کے خواہش مند تھے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ملا اور مولانا اس تحریک کے ذریعے اپنے مفادات کے حصول کے خواہش مند تھے۔ اس تحریک سے ان کے عزت مآب خلیفہ کو چاہئے کوئی فائدہ پہنچتا یا نا پہنچتا ان کے اپنے مفادات بڑے احسن انداز میں پورے ہو رہے تھے۔ اس تحریک کے نتیجے میں یہ لوگ ہندوستان کی مسلمان سیاست میں سربراہی (Fore Front) کے منصب پر فائز ہو گئے اور ہندوستان کی سیکولر اور تعلیم یافتہ لیڈر شپ پس پشت چلی گئی۔ خلافت تحریک کی وجہ

سے ہندوستان کی مسلمان کلرجی (clergy) اس قابل ہوئی کہ وہ ہندوستان کے سیاسی منظرنامے میں اپنے لئے ایک اہم مقام حاصل کر سکے جس کے لئے اس نے قوم پرستی کالبادہ اوڑھ لیا تھا۔ اس مرحلے پر انھوں نے اپنے لئے ایک سیاسی تنظیم بھی بنانے کا فیصلہ کرلیا جس کا نام انھوں نے جمعیت علماء ہند رکھ لیا۔

ہندوستان خلافتی اور ترکی کے معاملے کی حقیقت

ہندوستان کے خلافتی ان قوتوں کی اصل اہمیت کا اندازہ ہی نہ لگا سکے جو کہ ترکی کی نئی صورتحال کی تشکیل نوع کررہی تھیں اور ناہی ان اہم تبدیلیوں کا جو کہ اس وقت ظہور پذیر ہورہی تھیں۔ قاضی محمد علی عباسی جو کہ نہ صرف اردو صحافت کا اہم نام تھے بلکہ اس وقت خلافت تحریک کی سیاست میں اہم کردار ادا کر رہے تھے، انکی ترکی کے حقیقی حالات سے نا آشنائی کی حالت یہ تھی کہ انہوں نے انہیں سماجی تبدیلیوں کو سمجھنے کے بجائے انہیں ذاتی رنجشوں اور باہمی تکرار کا نام دیتے ہوئے انہیں سازشوں سے تعبیر کیا (۵۲)۔ ایک طرف تو وہ مصطفیٰ کمال کی کامیابیوں اور خاص طور پر یونان کی فتح پر اسے غازی کے لقب سے بھی پکارتے ہیں اور دوسری طرف خلیفہ کی قسمت پر آنسو بھی بہاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ عباسی لکھتے ہیں کہ مصطفیٰ کمال نے خلیفہ مسلمین کو چیلنج کیا جس کی وجہ سے سلطان بے یارو مددگار رہ گئے۔ بعدازاں وہ اپنے فرنگی آقاؤں (مغربی طاقتوں سے) شکایت بھی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ انھوں نے ترکوں کی عوامی جدوجہد کو دبانے اور خلیفہ کو برقرار رکھنے کے لئے کوئی خاص کرار ادانہ کیا (۵۳)۔ عباسی کے اس بیان سے ہندوستان کے خلافتیوں کی تحریک خلافت میں پائے جانے والے تضادات اور ان کے اس سارے معاملے سے لاعلمی کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ یہ انتہائی تکلیف دہ بات ہے کہ ہندوستان کا ایک انتہائی اہم خلافتی لیڈر جو کہ برطانوی کے نوآبادیاتی نظام کے خلاف لڑنے کا دعوے دار بھی ہو اور وہ برطانیہ سے یہ شکایت کرتا نظر آئے کہ اس نے مداخلت کرکے ترکی کے قوم پرستوں کو شکست دینے اور "بے یارو مددگار" خلیفہ کو بچانے کے لئے کوئی کردار ادانہ کیا۔ عباسی کا یہ تضادی رویہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ یہ رویہ درحقیقت عمومی طور پر ہندوستان کے تمام خلافتیوں کی اس جہالت اور صورتحال کو نہ سمجھنے کی عکاسی کرتا ہے جو کہ اس وقت ہندوستانی خلافتی قیادت کے ذہنوں میں خلافت کے

متعلق پائی جارہی تھی۔ یہ قیادت اس تاریخی جدوجہد اور حقائق کو سمجھ ہی نہ سکی جو کہ اس وقت ترک معاشرے میں مصروف عمل تھی۔ درحقیقت ترکی کی قوم پرست عوام کے کردار کو حقیقی معنی میں سمجھنا ان خلافتیوں کے بس سے ہی باہر تھا۔ انھوں نے کسی بھی مرحلے پر ترکی کی عوامی قوم پرست تحریک کی اہمیت کو سمجھا ہی نہیں اور نا ہی کسی مرحلے پر خلیفہ کے مقابلے میں انھوں نے ترک عوام کی عوامی جدوجہد کو قابل غور جانا۔

یہ کوئی حیرت انگیز بات نہیں کہ حکومت ہند نہ صرف تحریک خلافت کے لئے قابل برداشت رویہ رکھتی تھی بلکہ وہ اس کی مکمل طور پر حمایت بھی کر رہی تھی۔ حکومت برطانیہ ابتداء ہی سے خلافت تحریک کی بھرپور مدد کر رہی تھی اور اسے ایک اچھا مزہ (quite good humour) تصور کر رہی تھی تاوقتیکہ گاندھی کی سول نافرمانی کی تحریک نے اس کا رنگ بدل کر رکھ دیا۔ اس بات کی اہمیت کو بالکل نظر انداز نہیں کرنا چاہئے کہ یہ بالکل وہی مرحلہ تھا جب خلافت تحریک نے کچھ جان پکڑنے کی کوشش کی تو عین اس مرحلے پر برطانیہ کی نوآبادیاتی حکومت نے جنگ عظیم اوّل کے دوران گرفتار کئے گئے رہنماؤں محمد علی، شوکت علی، آزاد اور ظفر علی خان جو کہ اس تحریک کی سربراہی کر رہے تھے اور اس تحریک کے بااثر افراد میں شامل تھے ان کو آزاد کر دیا۔ اس لئے کے ان خلافتی رہنماؤں کا بعد از جنگ خلیفہ کے لئے ہمدردانہ رویہ اور تحریک کسی بھی طرح برطانوی حکومت کے لئے خطرات کا باعث نہ تھی بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ یہ تحریک چلا کر برطانوی کی حکومت کے منصوبوں میں اس کے زبردست معاون و مددگار ثابت ہو رہے تھے۔

برطانوی حکومت کی اس تحریک کے لئے کھلم کھلا حمایت کا اندازہ ان کے اس فیصلے سے لگایا جاسکتا ہے جب انھوں نے تحریک خلافت کے لئے مالی مدد فراہم کی تاکہ وہ اپنے نقطۂ نظر کا دفاع یورپ جا کر کر سکیں۔ ۱۹۲۰ میں خلافتی وفد جس کی سربراہی ڈاکٹر انصاری کر رہے تھے وہ وائس رائے لارڈ چمسفورڈ (Chelmsford) سے ملا جس نے اس ملاقات میں وفد میں شامل اراکین کو حکومت برطانیہ اور اپنی مکمل مدد اور حمایت کا یقین دلایا۔

ہندوستانی خلافتیوں کے برطانوی سرکار کے ساتھ گرم جوشی کے روابط کی ایک "ہلکی سی جھلک (Petty details)" ہمیں "مولانا" شوکت علی کے اس خط سے واضح ہوتی ہے جو کہ انھوں نے ۲۰ جنوری ۱۹۲۰ کو برطانوی حکومت کے ایک افسر Mr. Maffey کو لکھا جس میں

انھوں نے یہ درخواست کی کہ ہندوستانی حکومت ان کے اور تحریک خلافت کے دیگر پانچ اراکین کے یورپ کے فضائی سفر کے لئے فرسٹ کلاس کے ٹکٹوں کا بندوبست کریں تا کہ یہ لوگ یورپ جا کر برطانوی عوام اور پارلیمنٹ اور پیرس کی امن کانفرنس میں خلافت کی بحالی کے لئے اپنے نقطۂ نظر کو وہاں پیش کر سکیں۔ شوکت علی کی اس درخواست کا ایک سرسری جائزہ لینے سے یہ بات سامنے آجاتی ہے کہ نو آبادیاتی نظام کے خاتمے کے لئے چلائی جانے والی تحریک کے نام نہاد چیمپیئن کس طرح اپنے نو آبادیاتی مالکوں کے آگے بھیک مانگتے نظر آتے ہیں۔ حکومت ہند کے محکمۂ داخلہ کے سیکریٹری نے شوکت علی کی اس درخواست پر فوری کاروائی کرتے ہوئے حکومت بمبئی سے فوری رابطہ کر کے بمبئی کی حکومت کو یہ ہدایت کی کہ خلافت تحریک کے لیڈروں کے اس دورے کی سیاسی اہمیت کو دیکھتے ہوئے ان کے سفر کے لئے بہترین انتظامات کریں۔ اس واقعہ سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ برطانوی حکومت خلافت تحریک کو بالکل بھی اپنے لئے خطرے کا باعث نہیں سمجھتی تھی کیونکہ یہ برطانوی مفادات کو ٹھیس نہیں پہنچا رہی تھی۔ برطانیہ کے لئے یہ تحریک اس وقت پریشانی کا باعث بنی جب کانگریس کے چند لوگوں نے سول نافرمانی کی تحریک شروع کرنے کا ارادہ کیا اور چند انفرادی لوگوں نے مسلمانوں سے یہ التجا اور اپیلیں کرنا شروع کر دیں کہ وہ برطانوی فوج کی نوکری نہ کریں۔ ایسے بیانات برطانوی مفادات کو نقصان پہنچانے کے مترادف تھے۔ لیکن سول نافرمانی کی تحریک کے لئے یہ اپیلیں صرف کانگریس کے حلقوں کی طرف سے کی جا رہی تھیں اور خلافتی لیڈروں نے ان کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

عام طور پر تحریک خلافت کو ایک ایسی تحریک تصور کیا جاتا ہے جو کہ اپنے ظہور میں نو آبادیاتی نظام کے خلاف اٹھی تھی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس تحریک کی سب سے اہم "کامیابی" یہ ہے کہ اس نے ہندوستان کے مسلمانوں کو سیکولر سیاست سے الگ کر کے انھیں مذہبی اور کمیونل سیاست کے قریب کر دیا۔ اس تحریک نے مسلمان علماء (clergy) کی سیاسی پھڑتی (Activism) کی ایک ایسی روایت چھوڑی جو کہ ہندوستان اور پاکستان کی سیاست کو آج بھی ایک مسئلہ (Bedevils) تصور کرتی ہے۔ اس تحریک کا سب سے آخری تضادی پہلو (Final Irony) یہ تھا کہ گاندھی جو کہ ہندوستان کی "سیکولر" ہندوستانی قوم پرستی کے علم بردار تھے وہ اس دور افتادہ (Atavistic) تحریک کے ڈکٹیٹر (Dictator) ثابت ہوئے جس نے بالآخر ترکی کے قوم

پرستوں کو بھی دغا دیا اور عرب قوم پرستوں کے ساتھ بھی بے وفائی کی۔ گاندھی ایک جہاں دیدہ اور عقل مند سیاسی لیڈر تھا جو کہ ترکی اور عرب کے علاقوں میں اٹھنے والے تحریکوں کے اصل سیاسی حالات سے انجان نہ تھا۔ اس کا اس مسئلے میں ادا کئے جانا والا کردار بہت سارے سوالات کو جنم دیتا ہے جن کے جوابات دئے جاتے انتہائی ضروری ہیں۔ بدقسمتی سے اس تحریک کی نوعیت اور گاندھی کی قیادت کی وجہ سے بہت سارے ہندوستانی قوم پرست محققوں نے اس تحریک اور اس میں گاندھی کے کردار کو تنقید کے نظر سے دیکھا ہی نہیں۔ جبکہ دوسری طرف محمد علی جناح (جسے اس مصنف نے کئی مرتبہ غلطی سے مذہبی رہنما (Communalist Leader) ہونے کا موردالزام ٹہرایا ہے وہ اس معاملے میں سیکیولر نقطہ نظر رکھنے والے شخص ثابت ہوئے) کو "مولانا" شوکت علی نے اس (Activists) مذہبی تحریک کی مخالفت کرنے پر عملی حملہ (Physically Beaten) بنایا۔ جس کے اثرات ہندوستانی (اور پاکستانی) مسلمان سیاست پر انتہائی منفی اثرات پڑے۔ خلافت تحریک نے مسلمانوں بنیاد پرستوں (clergy) کی سیاسی قیادت کی بنیاد رکھی جسے بعد از ان مسلمان نظریہ سازوں نے باآسانی اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرنا شروع کر دیا۔

حوالہ جات

(۱) گیل مینالٹ (Minault Gail) کی ۱۹۸۲ میں خلافت تحریک پر شائع ہونے والی تحقیق اس موضوع پر ہونے والی اب تک کی سب سے بہترین تحقیق ہے۔ لیکن اس کی تحقیق میں عمومی طور پر ان باتوں پر یقین کرلیا گیا جن پر اس تحریر میں سوالات اٹھائے گئے ہیں۔

(۲) Arnold، ۱۹۲۴، صفحہ ۹۴۔

(۳) Hitti، P.K، صفحہ ۶۷۲۔

(۴) صفحہ ۶۷۷-۶۷۶، Hitti۔

(۵) صفحہ ۱۲۱، ۱۹۶۱، Lewis, Bernard

(۶) غزالی ۱۹۶۴ صفحہ ۴ اور الماوردی ۱۹۶۰، باب اوّل، حصہ اوّل

(۷) ہندوستان کے ان علماء جنہوں نے اس اس فتوے کے حق میں دستخط کئے اور جنہوں نے اس پر دستخط سے انکار کیا اس کی فہرست Minault کی کتاب (1982) کے صفحہ ۸۰ پر دیکھا جا سکتا ہے۔

(۸) اس مسئلے پر مختصر مطالعے کے لئے دیکھیے علوی Alavi ۱۹۸۸ صفحہ ۸۴

(۹) سنیال (Sanyal) کی ۱۹۹۲ میں آنے والی تحریر بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ بریلوی روایات کی ایک بڑی طویل تاریخ ہے۔ اس کی ابتداء احمد رضا خان نے نہیں کی تھی لیکن اس صدی کے وہ ایک بریلوی ایک اہم بریلوی سربراہ تھے۔

(۱۰) مولانا آزاد کے یہ جملے قاضی محمد عدیل عباسی (Abbasi، ۱۹۸۲) سے لئے گئے ہیں۔ یہ الفاظ آزاد نے جنگال کی صوبائی خلافت سانوس کے اجلاس مورخہ ۲۸ فروری ۱۹۲۵ کو خطا کرتے ہوئے کئے۔ عباس نے یہ الفاظ زمیندار کے اخبار کے ریکارڈ سے نکال لئے ہیں جو کہ تحریک خلافت کے پروپگنڈہ کا سب سے اہم اور مؤثر زریعہ تھا اور عباسی اس اخبار کا ڈپٹی آیڈیٹر تھا۔ اس

کے ساتھ ساتھ عباسی آزاد کا ایک قریبی رفیق اور دوست بھی تھا اور تحریک خلافت کا ایک نہایت ہی معتبر نام بھی تھا۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کی آزاد کے یہ سورش کاشمیری کی ادارت میں شایع ہونے والی کتاب "خطابات آزاد" (Azad،۱۹۴۴) میں حزف کردئے گئے۔ اس کے مقابلے میں عباسی آزاد کے زیادہ قریب تھے اور ان کے الفاظ زیادہ قابل بھروسہ ہیں۔ آزاد کے ان اہم خیالات اور الفاظ کے بعد ازاں ملک رام Malik Ram کی ادارت میں شایع ہونے والے "خطبات آزاد" (Azad،۱۹۷۴) مین بھی نظر انداز کر دیا ہے۔

(۱۱) خلیفہ اور امام کے الجھے ہوئے القابات میں سے آزاد اس بگڑی ہوئی نظریاتی روایت کو قبول کیا ہے جو کہ عباسی دور کے آخری ایام میں رواج پذیر ہوئی اور جہاں خلیفہ کے رتبے کو امام کی غیر ضروری مذہبی خصوصیات کے ساتھ ایک مذہبی کردار دے دیا گیا۔

(۱۲) یہ شرط ہندوستان کے معاملے میں لاگو نہیں ہوتی کیونکہ عثمانی سلطان اس علاقے کے حکمران نہ تھے۔

(۱۳) مودودی Maududi، ۱۹۶۱، صفحہ ۳۸

(۱۴) سرسیّد احمد خان لکھتے ہیں "اپنے تین خلیفہ کے لفظ سے اپنے آپ کو تعبیر کیا"

(۱۵) سرسیّد احمد خان ۱۹۶۲، صفحہ ۱۲۲۔۱۲۵

(۱۶) خلفاء لفظ خلیفہ کی جمع ہے

(۱۷) الماوردی Al-Mawardi، ۱۹۶۰، صفحہ ۷۰۔۶۹

(۱۸) Goldziher، ۱۹۷۱، صفحہ ۶۸۔۶۷

(۱۹) آزاد Azad، خطبات آزاد، لاہور، ۱۹۴۴، صفحہ ۱۹۲

(۲۰) سیّد احمد خان Syed Ahmed Khan, ۱۹۶۲، صفحہ ۱۶۵

(۲۱) شعبان Shaban، ۱۹۸۰، ۱۹

(۲۲) ہٹّی Hitti، ۱۹۶۰، صفحہ ۴۶۵، مذید دیکھئے آرنلڈ Arnold ۱۹۲۴ صفحہ ۵۷

(۲۳) گولڈزر (Goldziher) ۱۹۷۱، صفحہ ۶۸۔۶۷، لفظ خلیفۃ اللہ درج ذیل زیر بحث آیا

(۲۴) بوسورتھ Bosworth، ۱۹۶۷

(۲۵) اسٹوجانوک Stojanovic، ۱۹۳۹، صفحہ ۲

(۲۶) گیوہر Gewhr، ۱۹۶۷، ۲۸

(۲۷) اناليک Inaleik، ۱۹۷۳، صفحہ ۱۲۳

(۲۸) علوی Alavi، ۱۹۸۸، صفحہ ۶۸

(۲۹) اس سلسلے میں مزید مفید عبدالسلام خورشید کا ایک چھوٹا سا کتابچہ بڑا اہم بمقابل امداد صابری کی تین جلدوں پر مشتمل ضخیم کتب (Sabri، ۱۹۵۳)

(۳۰) مینالٹ Minault ۱۹۸۲ صفحہ ۵۱

(۳۱) فیروز احمد جدید ترکی کے ایک نامور تاریخ دان تھے اور انہیں پاکستان کے مارکسی اور سندھی قوم پرست اسکالر فیروز احمد نہ سمجھا جائے۔

(۳۲) فیروز احمد ۱۹۹۳، صفحہ ۴۰

(۳۳) آغا خان Agha Khan، ۱۹۵۴، صفحہ ۱۶۳

(۳۴) آغا خان Agha Khan، ۱۹۵۴، صفحہ ۱۶۳

(۳۵) آغا خان Agha Khan، ۱۹۵۴، صفحہ ۱۶۴

(۳۶) لیوس Lewis ۱۹۶۱، ۲۳۳

(۳۷) آغا خان Agha Khan، ۱۹۵۴، صفحہ ۱۶۵

(۳۸) آکسن Aksin، ۱۹۷۶، ۲۲۹، میں اس کے لئے ڈاکٹر ہکی Dr. Hakki Rizatepe کا مشکور ہوں کہ جنھوں نے مجھے اس مضمون کے لئے آسکن سے ترکی زبان سے مضمون کو ترجمہ کر کے دیا۔

(۳۹) محمد علی کی انڈین نیشنل کانگریس کے ۲۶ دسمبر ۱۹۲۳ کے جلسے میں صدارتی خطبہ پر تقریر۔ محمد علی ۱۹۴۴ صفحہ ۲۹۹ سے لی گئی

(۴۰) آسکن Askin ۱۹۷۶، صفحہ ۹۳

(۴۱) آسکن Askin ۱۹۷۶، صفحہ ۱۶۸

(۴۲) لیوس Lewis، ۱۹۶۱، ۲۳۵

(۴۳) عباسی Abbasi ۱۹۸۶، ۱۲۱۰ اور لیوس ۱۹۶۱، ۲۴۶

(۴۴) لیوس Lewis، ۱۹۶۱، صفحہ ۲۴۲

(۴۵) اتاترک Ataturk، ۱۹۶۳، صفحہ ۵۔۴۰۷ صفحوں پر مشتمل یہ تقریر اتاترک نے ۶ دنوں میں

اکتوبر ۱۹۲۷ میں ریپبلکن پارٹی کے نمائندوں اور وفود سے خطاب کرتے ہوئے یہ طویل تقریر کی اور حاضرین کی صبر کی داد دی انہوں نے بیٹھ کر یہ تقریر سنی۔

(۴۶) اتاترک Ataturk ۱۹۶۳ صفحہ ۸، مصطفیٰ کمال کی اس طویل تقریر میں خلیفہ کے کردار پر شدید غصہ کا اظہار کیا گیا۔

(۴۷) اس ۶ روزہ تقریر کی اہم بات یہ تھی کہ مصطفیٰ کمال کے خلیفہ کے مذہبی اور سیکولر کردار کے بارے میں بڑی وضاحت سے بات کی اور بادشاہ کا لفظ سلطان کے سیکولر اور خودمختار حکمران ہونے کے معنوں میں استعمال کیا گیا۔

(۴۸) اتاترک Ataturk ۱۹۶۳، صفحہ ۷

(۴۹) اتاترک Ataturk ۱۹۶۳، صفحہ ۱۰

(۵۰) اتاترک، ۱۹۶۳، صفحہ ۱۱

(۵۱) فیروز احمد Feroz Ahmed، ۱۹۹۳، صفحہ ۴۸

(۵۲) عباسی Abbasi ۱۹۸۶، صفحہ ۱۹۹

(۵۳) عباسی Abbasi، ۱۹۸۶، صفحہ ۲۰۸

(۵۴) ہوم پول Home Poll، ۵۸۸، ۱۹۲۰، صفحہ ۲۔۱۴

Abbasi, Qazi Mohammad Adeel, 1986, Tehrik-e-Khilafat, Lahore

Agha Khan, The, 1954, The Memoirs of Aga Khan, New York

Ahmad, Aziz, 1964, Studies in Islamic Culture in the Indian Environment, Oxford

Ahmad, Aziz, 1967, Islamic Modernism in India and Pakistan, London.

Ahmad, Feroz, 1969, The Young Turks: The Committee of Union and Progress in Turkish Politics 1908-1914, Oxford.

Ahmad, Feroz, 1984, 'The Late Ottoman Empire', in Ma. .n

Kent (ed) The Great Powers and the end of the Ottoman Empire, London.

Ahmad, Feroz, 1993, The Making of Modern Turkey, London.

Alavi, Hamza, 1988, 'Pakistan and Islam: Ethnicity and Ideology' in Fred Halliday (ed), State and Ideology in the Middle East and Pakistan, London and New York.

Aksin, Sina, 1976, Istanbul Hukumetleri va Milli Mucadele, Istanbul.

Ansari, Sarah, F.D., 1992, Sufi Saints and State Power: The Pirs of Sind, Cambridge

Arnold, T.W., 1924, The Caliphate, London.

Ataturk, Mustafa Kemal, 1963, A Speech Delivered by Mystafa Kemal Ataturk, 1927, 744pp, Speech delivered before the Deputies of the 'Republican Party' from 15th to 20th October, 1927, Istanbul.

Atiyah, E., 1958, The Arabs, Harmondsworth.

Azad, Abul Kalam, 1944, Khutbaat-e-Azad, edited by Sorish kashmiri, Lahore

Azad, Abul Kalam, 1974, Khutbaat-e-Azad, edited by Malik Ram, Delhi.

Azad, Abul Kalam, n.d./a, Tazkira, ed. Malik Ram, Islamic Publishing House, Lohore.

Azad, Abul Kalam, n.d./b, Azad ki Kahani Khud Azad ki Zabani, Malihabadi (ed), Lahore.

Bosworth, C.E., 1967, The Ismalic Dynasties, Edinburgh.

Evangelos, K., n.d. Greece and the Eastern Question.

Gewehr, W.M., 1967, The Rise of Nationalism in the Balkans: 1800-1930.

Ghazali, Imam, 1964, Counsel for Kings (Basihat Al-Muluk) with Introduction by F.R.C. Bagley, London.

Gibb, H.A.R., 1962, Studies on the Civilization of Islam, London.

Gokalp, Ziya, 1959, Turkish Nationalsim and Western Civilization, London.

Goldziher, Ignaz, 1971, 'Umayyads and Abbasids' in Muslim Studies, Vol.II, London.

Greenwall, H.J, 1952, His Highness the Aga Kha, London.

Hardy, Peter, 1972, The Muslims of British India, Cambridge

Hasan, Mushirul (ed), 1985, Communal and Pan-Islamic Trends in Colonial India, New Delhi.

Hasan, Mushirul (ed), 1992, Islam and Indian Nationalism: Reflections om Abul Kalam Azad, New Delhi.

Hitti, P.K., 1960, History of the Arabs, London.

Hourani, A.H., 1945, Great Britain and the Arab World, London

Husain, Mahmud, 1957a, A History of the Freedom Movement, Karachi.

Husain, Mahmud, 1957b, 'Tipu Sultan' in Mahmud Husain

(ed) 1957a

Ikram, S.M., 1965, Mauj-e-Kauthar, Lahore (reprint)

Inalcik, halil, 1973, The Ottoman Empire: The Classical Age 1300-1600, London.

Jackson, Stanley, 1952, The Aga Khan, London.

Khurshied, Abdus Salaam, n.d.Sahafat: Pakistan va Hind main (in Urdu), Lahore.

Lewis, Bernard, 1961, The Emergence of Modern Turkey, London

Margoliouth, D.S., 1922, 'The sense of the Title Khalifah' in T.W. Arnold and R.A. Nicholson (eds) A Volume of Oriental Studies Presented to Edward G. Browne, Cambridge.

Maududi, Abul A'la, 1961, Tajdid va Ahyay-e-Din, Lahore (reprint)

Maududi, Abul A'la, 1982, Khilafat va Mulukiyat, Lahore (reprint)

Al-Mawardi, Abul-Hassan, 1960, Al-Ahkam as-Sultaniya, Cairo.

Minault, Gail, 1982, The Khilafat Movement: Religious Symbolism and Political Mobilisation in India, Delhi.

Minault, Gail, 1992, 'The Elusive Maulana: reflections on Writing Azad's Biography' in Hassan (ed) 1992.

Mohammad Ali, 1944, Speeches and Writings of Maulana Mohammad Ali, Lahore.

Nuseibeh, H. Zaki, 1959, The Ideas of Arabs Nationalism, Ithaca

Owen, S.J. (ed), 1877, Selections from Wellesley's Despatches, Oxford.

Sabri, Imdad, 1953, Tarikh-e-Sahafat-e-Urdu, Delhi, 3 volumes.

Sanyal Usha, 1996, Devotional Politics in British India: Ahmad Riza Khan Barelwi and his Movement, 1870-1920, New Delhi (Forthcoming)

Shaban, M.A., 1980, Islamic History, Vol.I, Cambridge (reprint)

Shaban.M.A., 1981, Islamic History, Vol II, Cambridge (reprint)

Shukla, R.L., 1973, Britain, India and the Turkish Empire, 1853-1882, New delhi.

Stojanovic.M.D., 1939, The Great Powers and the Balkans: 1875-1878, Cambridge

Sunar, Ilkay, 1974, State and Society in the Politics of Turkey's Development, Ankara.

Syed Ahmad Khan, 1962, Maqalat-e-Sir Syed, Vol I, Lahore- articles on 'Khilafat', 'Khilafat aur Khalifa' and 'Imam aur Imamat'.

☆☆☆

اکبر اعظم: تیسرا باب

بغاوت

ڈاکٹر احمد شبیر
ترجمہ: محمد نفیس

شیخ مبارک اور ابوالفضل کی یہ خواہش تھی کہ اکبر بادشاہ ملک کا سیاسی اور مذہبی رہنما بن جائے۔ اس طرح نہ صرف وہ اپنے دشمنوں کو نقصان پہنچا سکتے تھے بلکہ وہ اپنے آپ اور اپنے جیسے دوسرے لوگوں کو بھی ناموافق حالات سے بچا سکتے تھے۔

اسلامی ریاست میں سربراہ مملکت ہی مذہبی رہنما ہوتا ہے۔ اس لئے ان کا یہ منصوبہ مذہبی لحاظ سے خلاف اسلام نہ تھا۔ لیکن وہ سرعام اکبر کو خلیفہ کا لقب عطا کرنے سے قاصر تھے۔ سنّی العقیدہ مسلمان کے لئے سلطنت عثمانیہ کا سلطان ہی دراصل ان کا خلیفہ (1) تھا اور اکبر کے دربار میں تمام رؤساتر کی النسل منگول، ہندوستانی اشرافیہ، اور مسلم فوج کی اکثریت بھی ایشیاء وسطیٰ سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کے علاوہ ہندوستان میں بسنے والے مسلمانوں کی اکثریت کا تعلق بھی سنّی فرقے سے تھا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اکبر اعظم اپنی سلطنت کی تصدیق خلیفہ عثمانیہ سے حاصل کرتا تھا۔ سلطان بایزید کو امیر تیمور کے ہاتھوں شکست ہو چکی تھی اور وہ اس کی قید میں تھا اور مغل ہمیشہ سلطنت عثمانیہ کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔

شیخ مبارک اور ابوالفضل کے پاس ایک ہی متبادل راستہ تھا کہ وہ اکبر اعظم کو "امام"(2) کا

ڈاکٹر احمد شبیر کی کتاب "اکبر اعظم کا دوسرا باب" تاریخ کے شمارہ 42 میں شائع ہو چکے ہیں۔

رتبہ دیدیں۔ سنّی العقیدہ مسلمانوں کے لئے اس کی حیثیت ایک سربراہ مملکت سے زیادہ نہ تھی اور اس سے کسی طرح بھی خلیفہ کا مطلب نہیں نکالا جا سکتا تھا۔ لیکن وہ خود اپنے طور پر اکبر اعظم کو اسماعیلی طرز پر ''امامِ وقت''(3) بنانے کے لئے کوشاں تھے جس کی حیثیت خلیفہ سے بھی برتر ہو یعنی ''عالم اسرار کا فرمان روا''۔

شیخ مبارک نے نہایت ہوشیاری سے اکبر کو یہ لقب عطا کرنے کے لئے ایک دستاویز تیار کی تھی جس میں لفظ ''خلیفہ'' کو ہذف کر دیا گیا تھا اور اس کی جگہ ''امام'' کا لفظ اس طرح استعمال کیا گیا تھا کہ اس سے سربراہ مملکت کا گماں گذرے۔ اسی طرح خلیفہ کا ہم معنی لقب ''امیر المومنین'' کا استعمال بھی اکبر کو پہلے دیئے گئے دو القابات کے بعد کیا گیا تا کہ وہ زیادہ نمایاں نہ ہو سکے جبکہ وہ آج بھی وہاں موجود ہے۔(4)

اکبر کو پہلے سلطان کا لقب دیا گیا جو کہ ایک عام سا لقب تھا۔ اس کا استعمال نہایت محتاط طریقے سے کیا گیا تا کہ علماء اس پر اعتراض نہ کر سکیں۔ کاغذ کے صفحے پر اس لقب کی حیثیت کچھ زیادہ نہ تھی لیکن عملاً وہ ایک مذہبی قوت کا حامل لقب تھا۔

غیر تعلیم یافتہ ہونے کے سبب اکبر ان صلاحیتوں سے عاری تھا کہ قرآنی احکامات کی ترجمانی کر سکے۔ شیخ مبارک اور ابوالفضل اس کے لئے یہ خدمات ادا کرنے کے لئے ہمہ وقت تیار تھے۔ انتقام کی خواہش، شرور سوخ، طاقت، شہرت اور نام ونمود کی رغبت وخواہش آہستہ آہستہ اپنا اثر دکھا رہی تھی لیکن اس جدل میں جو ہتھیار استعمال کئے جا رہے تھے انہوں نے فاتح کے لئے کچھ بھی باقی نہ چھوڑا تھا۔ ابوالفضل نے خود اور عبادت خانے کی فکری نشستوں میں بیٹھنے والے دوسرے ہم خیالوں کے ساتھ مل کر تمام اسلامی افکار پر مشتمل اپنا فلسفہ تیار کیا تھا جو یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا تھا کہ ان کے مخالفین ایک ایسی بے راہ روی کا شکار ہیں جس کی کوئی منزل نہیں۔ وحی کیا ہے؟ پیغمبری کسے کہتے ہیں؟ معجزات کیا چیز ہیں؟ نماز اور عبادت کیا ہوتی ہیں؟ روزہ کیوں رکھا جائے؟ یہ وہ موضوعات تھے جن پر بحث کی جاتی تھی اور اکبر اعظم کے لئے انہیں سمجھنا بے حد مشکل تھا۔ وہ ابوالفضل اور اس کی قبیل کے لوگوں کی طرح کتابی کیڑا نہ تھا جن کے پاس اس قسم کے سوالات اور ان کے تیار شدہ جوابات محض بحث ومباحثے کے لئے ہر وقت تیار رہتے تھے لیکن ان کا ذاتی زندگی سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اکبر کوئی عالم نہیں تھا۔ وہ تو ایک باعمل آدمی تھا۔ خواہ میدان جنگ ہو یا علم وفکر کا میدان وہ ہر حال میں عملیت پسند

(Practical) آدمی تھا۔ اس وقت بھی جبکہ یہ تعلیم یافتہ عالم اپنے بحث ومباحثوں کی محفلوں سے رات گئے دیر گھر آ کر نیند کے مزے لوٹ رہے ہوتے تھے وہ ان مسائل پر غور وفکر میں مبتلا ہوتا تھا۔ اس کی روح سچائی کی تلاش میں لگی رہتی تھی جبکہ شکوک وشبہات اس کے ذہن کو پریشان کئے رہتے تھے۔ (5)

حقیقت یہ ہے کہ ابوالفضل اور شیخ مبارک نے خود کو اکبر اعظم کا بدترین دشمن ثابت کیا تھا۔ انہوں نے اس کے ایمان وعقائد کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ مختلف فلسفوں کی بھول بھلیوں میں بھٹک کر رہ گیا تھا۔ اسے وحی کے نزول اور پیغمبری پر شبہ ہونے لگا تھا۔ معجزات، عبادت، اور روزہ رکھنے کی اہمیت اس کے لئے مشکوک ہو کر رہ گئی تھی۔ (6) وہ شیخ مبارک اور ابوالفضل کے تخلیق کردہ امام کا کردار ادا کرنے سے قاصر تھا۔ ان کی خواہش رہی ہوگی کہ وہ ایک عظیم تر امام کا رتبہ حاصل کرے۔

اس میں قصور ان کا اپنا بھی تھا۔ وہ ایک نوآموز شخص کو امام بنانے کے طریقہ کار پر عمل کرنا چاہتے تھے۔ ایک اسماعیلی ''داعی'' (dai) یا مبلغ اس نوآموز سے اکثر آ کر ملا کرتا تھا اور اس کے ذہن میں شکوک وشبہات پیدا کرنے کے بعد یہ بتاتا کہ صرف امام وقت ہی ان اسرار ورموز کو سمجھ سکتا ہے۔ اس کا ذہن تبدیل کرنے کے بعد اسے یہ بتایا جانے لگا کہ اب وہ آہستہ آہستہ ان اسرار ورموز سے آگہی حاصل کر سکے گا۔ مکمل آگہی کے انتظار میں وہ ہمہ تن ان کی خدمت میں لگا رہے یہاں تک کہ وہ ایک دن اس دنیا سے کوچ کر جائے۔ لیکن اس دوران اکبر کے ذہن میں بیٹھے ہوئے شکوک وشبہات کو دور کرنے اور ان اسرار ورموز سے واقف کرنے کی ذمہ داری کون لیتا؟ وہ کوئی عام آدمی نہ تھا کہ علماء کی خدمت کے لئے ہر وقت کمربستہ رہے۔ وہ تو ہندوستان کا شہنشاہ تھا۔ وہ ان سے وہیں اپنے دربار میں سب کچھ جاننا اور سننا چاہتا تھا۔ شیخ مبارک اور ابوالفضل کے پاس اس کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے کوئی جامع منصوبہ نہ تھا۔ نتیجتاً انہیں دوسروں سے رجوع کرنا پڑا۔

اکبر سچائی سے ناآشنا تھا اور وہ اس کا دعویٰ بھی نہیں کرتا تھا کیونکہ اس کی ایسی کوئی خواہش نہ تھی۔ امام کا دعویٰ تھا کہ وہ الفاظ کے پیچھے چھپے اصل مطلب سے آگاہ ہے۔ وہ ظاہری اشکال میں پوشیدہ اسرار سے شناسائی رکھتا ہے کیونکہ اسے ہزاروں بھولے بھالے انسانوں کو ورغلا کر اپنے لئے ایسی فوج ظفر موج تیار کرنے کی ضرورت تھی جو اس کے سیاسی مقاصد کی خاطر لڑنے مارنے اور مر جانے کے جذبے سے سرشار ہو۔ اکبر کو بے شعور اور عقل کے اندھے جنگجوؤں کی ضرورت نہ تھی۔ وہ اپنی سلطنت کو اپنے زورِ بازو اور ان جنرلوں کی مدد سے قائم کر چکا تھا جو مسلمانوں،

ہندوؤں، شیعہ اور سنیوں پر مشتمل تھی۔ یہ تمام جنرل اپنے شہنشاہ کی ایسی تندہی سے خدمت کے لئے تیار رہتے تھے جس طرح کوئی تابعدار ملازم اپنے آقا کی کرتا ہے۔

امام کے لئے ضروری تھا کہ وہ سب کچھ جانتا ہو۔ الفاظوں اور معنوں کا بادشاہ ہو اور سچائی سے مکمل طور پر آگاہ بھی۔ لیکن اکبر کو سچائی جاننے کے لئے دوسروں سے رجوع کرنا پڑتا تھا جن میں ہندو، پارسی، مشائخ، رشی (7) اور فقیر شامل تھے یہاں تک کے معمولی قسم کے بزرگ بھی ان میں شامل تھے۔ وہ ایک ایسا امام تو نہ بن سکا جو شیخ مبارک اور ابوالفضل کے معیار اور خواہش کے مطابق ہوتا لیکن وہ پھر بھی اسے اپنے من پسند رنگ میں اس قسم کے معذرت خواہانہ الفاظ کے ساتھ پیش کیا کرتے:

''سچائی کے آقا'' سب کچھ جانتے ہیں لیکن وہ خود نہیں جانتے کہ وہ سب کچھ جانتے ہیں۔ وہ دوسروں سے سیکھنا چاہتے ہیں کیونکہ وہ دوسروں کی عزت افزائی کرنا چاہتے ہیں۔ وہ ''آقائے معنویت'' ہیں لیکن اندھے عقیدت مند یہ نہیں دیکھ سکتے۔ یہی وہ طریقے تھے جن کے ذریعے وہ شہنشاہ کے عقائد اور عمل کی تعریف و توصیف کر سکتے تھے۔

اکبر نے ایک راجپوت شہزادی سے شادی کی تھی اور وہ ہندوؤں کے ساتھ بے حد قریبی تعلق رکھتا تھا۔ اپنے تجسس کے اطمینان کے لئے وہ پہلے ان کے مذہب میں دلچسپی لے چکا تھا۔ اب وہ اس میں ''سچ'' تلاش کرنے لگا تھا۔ دیوی برہمن (Devi Brahman) نے ہندو مذہب کے اسرار و رموز شہنشاہ کو سمجھائے اور اس نے کئی ایک مقدس رسومات کا بھی ذکر کیا جو سورج اور آگ کی پوجا سے متعلق تھیں۔ برہما، مہادیو اور وشنو، کرشن اور راما، اور درگا مہامائی کے متعلق بھی اسے بہت کچھ بتایا۔ اس نے ''کرم'' اور ''پنار جنم'' کی وضاحت بھی کی جو انسان کے کرتوت کی سزا و جزا روح کی ایک جسم سے دوسرے جسم کی منتقلی کے ذریعے ہوتی ہے۔ (8) ایک شخص امیر، غریب، بیمار، اندھا، معذور اور خوش و ناخوش اس لئے ہوتا ہے کہ اس نے اپنے پہلے جنم میں کوئی گناہ کئے ہوتے ہیں۔ اگر کوئی شخص امیر، صحت مند، خوبصورت، توانا اور خوش و خرم ہے تو اس کی وجہ وہ اعلیٰ اور نیک کام ہیں جو اس نے پہلے جنم میں کئے تھے۔ زندگی کی ناانصافیوں اور اسرار و رموز کی یہ ایک ایسی سادہ تشریح تھی جو آریائی ذہن ہندو یا یونانیوں نے پہلے ہی دریافت کر لی تھی۔ یہ ایک نہایت ہی اعلیٰ و ارفع تسلی تھی۔ اکبر اس پر یقین کرنے لگا تھا۔ وہ موت کے بعد روح کے ابدی ہو جانے

کے فلسفے کو سمجھنے سے قاصر تھا اسی طرح وہ ایک جنم سے دوسرے جنم میں ملنے والی جزا اور سزا کا فلسفہ بھی اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ (9)

پارسی مذہبی پیشوا، دستور مہر جی رانا جس کا تعلق گجرات کے شہر ویساری (Vesari) یا نُصاری (Nusari) سے تھا۔ اسے خاص طور پر اس مقصد کے لئے مدعو کیا گیا کہ وہ شہنشاہ کو زرتشت مذہب کے اسرار و رموز سے آگاہ کرے۔ (10) ظاہری اشکال کے بارے میں بتایا گیا کہ ان کے روحانی اثرات ہوتے ہیں۔ اکبر کو آزمائش کرنے سے کوئی انکار نہ تھا۔ اس نے مقدس چغہ اور اس کے گرد ایک مقدس پٹہ باندھنا شروع کر دیا۔ (11)

آگ کی تعظیم خدا کی روشنی کی حیثیت میں کی جانے لگی۔ شہنشاہ نے حکم دیا کہ محل میں ایک مستقل آتش کدے کا انتظام کیا جائے۔ (12)

حتیٰ کہ اس دور میں کہ جب اکبر اعظم غیر اسلامی مذہبی عقائد کو تسلیم کر رہا تھا کچھ مسلم عالم دین اس کو مشورہ دینے کے لئے تیار تھے کہ وہ اپنے عہد کا پیغمبر ہے۔ دہلی کے شیخ تاج الدین نے اکبر کے دربار میں حاضری دی اور اپنا نقطہ نظر پیش کیا کہ عالم پناہ درحقیقت ''ایک مکمل انسان'' یا ''اپنے عہد کے روحانی آقا'' ہیں۔ اس لئے ہر ایک کا یہ مذہبی فریضہ ہے کہ وہ عالم پناہ کے حضور سر جھکائے۔ (13) اس مقصد کے لئے اس نے شہنشاہ کے سامنے زمین بوسی کا مشورہ دیا۔ اس فرض کی ادائیگی کے لئے ہر ایک کو شہنشاہ کے آگے جھکنا یا سجدہ کرنا لازم ہو گیا جبکہ مسلمانوں کے لئے سجدہ کرنا صرف خدا کے سامنے لازم تھا۔

ایک اور فلسفیانہ نقطہ شیخ یعقوب کشمیری نے پیش کیا۔ وہ درحقیقت ہمدانی کا قول دہرا رہے تھے۔ اس نے کہا۔ ''پیغمبر کا کام رہنمائی کرنا اور شیطان کا کام بہکانا ہے۔ پیغمبری اور شیطانیت دونوں ہی زندگی میں اپنا اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ (14) موجودہ دور میں حضور اعلیٰ پیغمبری کی نمائندگی کر رہے ہیں (اشارے کے طور پر)۔''

اس وقت جبکہ شہنشاہ کو پیغمبری کا مشورہ دیا جا رہا تھا درباری ادیبوں نے اپنی کتابوں میں پیغمبر اسلام کی شان میں پیش کی جانے والی نعتوں کے روائتی استعمال کی اہمیت کو کم کرنا شروع کر دیا۔ خدا کی حمد و ثناء کے بعد وہ شہنشاہ کی مدح سرائی شروع کر دیتے۔ مسلمانوں کے لئے یہ ناپسندیدہ عمل تھا۔ (15)

ایک اہم ترین اور کئی برسوں سے طاقتور مذہبی عالم جس کی عوام الناس میں بھی بڑی عزت اور شہرت تھی اس کا نام عبدالنبی تھا۔

مخدوم اور اس کا اثر ورسوخ ایک خوف کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ ان سے توقع تھی کہ وہ ان معاملات پر اعتراض کریں گے اور مسلمانوں پر ان کی بات کا اثر بھی ہوگا۔ مخدوم دراصل دولت کا پجاری تھا جبکہ عبدالنبی میں بدایونی بھی کسی خامی کو تلاش کرنے سے قاصر رہا تھا علاوہ اس کے کہ وہ بہت خود پسند ہو گیا تھا۔ اسے اپنے نظریئے کے نتائج بھی بھگتنے پڑے۔ وہ جھکنے کے مقابلے میں ٹوٹ جانے کو ترجیح دیتا تھا اور یہ ایک ایسی خصوصیت تھی جس کی تعریف کی جانی چاہئے۔ اکبر اس سے خائف رہتا تھا۔ لیکن جب انہیں مکے کے لئے روانہ کر دیا گیا تو اس کے لئے یہ آسان ہو گیا کہ وہ اپنے پسندیدہ موضوعات پر آزادانہ گفتگو کر سکے۔ اس کے علاوہ جب دستاویز کی مکمل تصدیق ہو گئی تو وہ قرآنی احکامات کی تشریح کرنے کا مجاز ہو گیا تھا۔ اب اس کی قطعی ضرورت نہ تھی کہ کسی ماہر کی رائے کسی معاملے پر لی جائے۔ (16) وہ اسلامی عقائد اور طرزِ زندگی جن پر لوگ اب تک عمل کرتے آئے تھے اکبر کی نظر میں غیر حقیقی دکھائی دینے لگے۔ (17) اس نے نماز کو غیر ضروری قرار دے دیا۔ (18) اجمیر شریف کی زیارت کے لئے جب وہ آخری بار 1579 میں گیا تو اس نے حاضرین کے عقائد کا امتحان لینے کی کوشش کی۔ اس نے خصوصی طور پر قرآن شریف، وحی کے نزول، اور پیغمبری کے بارے میں ان کی رائے جاننے کی کوشش کی۔ وہ خود جنوں، فرشتوں، اور معجزات پر یقین نہیں رکھتا تھا اور نہ ہی قرآن کے تسلسل اور اسے خدا کا پیغام تسلیم کرتا تھا۔ (19) قرآن کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے جبکہ شہنشاہ کی تربیت شیخ مبارک اور ابوالفضل نے اسماعیلی طرز پر کی تھی اور فارس کے شیعہ علماء کا بھی اس پر اثر تھا۔ اکبر نے مضحکہ خیزی کے ساتھ یہ دعویٰ کیا:

> ''نابینا کے ہاتھ میں سچ کی حیثیت محض ایک کتاب (قرآن) اور چند پرانی قبریں ہیں۔ قبریں بولتی نہیں اور نہ ہی کسی کو قرآن کے اسرار سمجھنے کی ضرورت ہے۔'' (20)

اکبر جن عقائد پر یقین رکھنے لگا تھا وہ ہی قرآن کے اسرار و رموز کی حیثیت اختیار کر گئے۔ مسلم مفکر مسلسل اکبر کو ''اپنے عہد کا روحانی عالم''، ''نائب یا خدا کا خلیفہ'' کے طور پر تسلیم کرتے چلے

آ رہے تھے۔ (21) اب وہ خود بھی ان خیالات کو دہرانے لگا۔ ''کوئی خدا نہیں علاوہ خدا کے اور اکبر خدا کا مظہر ہے۔'' کلمہ مسلمانوں کے عقیدے کا بنیادی ستون ہے جس کا پیغام یہ ہے کہ ''کوئی معبود نہیں سوائے اللہ کے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے پیغمبر ہیں''۔ ''خدا کے نائب'' کے تصور کو جب اس کلمہ کے ساتھ ملا کر دیکھیں تو یہ کم و بیش ''پیغمبر'' کے ہم معنی دکھائی دیتا ہے۔ اس لئے عوام الناس کے سامنے اس کے برملا اظہار سے اجتناب کیا جاتا اور صرف محل کی چار دیواری میں چند مخصوص لوگ ہی اس کا استعمال کیا کرتے تھے۔ (22) لیکن جلد ہی یہ بات چاروں طرف پھیل گئی اور اس کے منفی اثرات مرتب ہونے لگے۔

علماء کے مذہبی جذبات سختی سے مجروح ہوئے تھے لیکن ان کی جیبوں تک اس کے اثرات ابھی نہیں پہنچے تھے۔ 1579 میں یہ بھی ہو گیا۔ عبدالنبی علماء میں لگان سے مبرا زمینیں اور جائیداد بانٹنے میں بے حد مشہور تھے۔ ایک سال قبل اکبر نے قاضی علی بغدادی کو اس کام پر فائز کیا تھا کہ وہ ان عطیات کا جائزہ لے اور ان میں کمی کرے اگر کہیں کوئی باقاعدگی دکھائی دے۔

اس سال اس نے ان عطیات کی تفصیل شہنشاہ کے حضور پیش کی تھی جو 100 سے لے کر 1000 بیگاہ رقبے پر محیط تھی۔ اکبر نے ان میں سے متعدد عطیات کے رقبے میں کٹوتی کا حکم صادر کر دیا جس کی وجہ سے علماء میں شدید بے چینی اور غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ (23) ایک ایسے دور میں جب کہ مسجد کا منبر عوام سے رابطے کا واحد اور اہم ترین ذریعہ تھا اور علماء اس کے اصل وارث تھے اکبر کا یہ قدم اس کے لئے شدید مشکلات کا باعث بن گیا۔

بہار میں بغاوت

اکبر مسلمانوں کا فرماں روا تھا اور یہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ مسلمانوں کو یہ ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ اپنے حاکم کا حکم بجا لائیں خواہ وہ کوئی نک کٹا سیاہ فام ہی کیوں نہ ہو بشرطیکہ وہ قانون کے مطابق حاکمیت کرے۔ بصورت دیگر ان کو ہدایت ہے کہ وہ اپنے حاکم کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں۔ اسلامی قوانین پر کسی پارلیمنٹ، مشیروں کی جماعت یا چیف جسٹس کی عدالت عالیہ کی اجارہ داری نہیں ہوتی۔ کوئی بھی مسلمان اسلامی قوانین کا مطالعہ کرنے کے لئے آزاد ہوتا ہے اور اس کے مطابق کسی بھی ضابطے کی منظوری دے سکتا ہے۔ کون شخص بول رہا ہے اس کی اہمیت نہیں بلکہ

دیکھا یہ جاتا ہے کہ وہ کیا بول رہا ہے۔ خلیفہ کا آزادانہ چناؤ زیادہ عرصے تک قائم نہ رہا۔ لیکن اسلامی جمہوریت کا جذبہ مسلمان فرمانرواؤں کو قابو میں رکھنے کے لئے کافی عرصے تک موثر رہا۔ جس کسی نے بھی مسلمانوں کے مذہبی یا سیاسی رہنما بننے کا دعویٰ کیا مسلمانوں نے یہ مطالبہ کیا کہ اس کا رہن سہن اور طرزِ فکر اسلامی نقطہ نظر کے مطابق ہونا چاہئے۔ ان کا اپنے حاکموں، رہنماؤں اور مصلحوں پر یہ بے لاگ تبصرہ اور تنقید بسا اوقات غیر مناسب، رجعت پسندانہ، نقصان دہ اور بے وقوفانہ ہوتا تھا لیکن یہ مسلمانوں کی تاریخ کی ایک حیران کن حقیقت ہے، اور یہ زندہ قوموں کی قوت کی نشانی بھی۔

1579 میں ملاّ محمد یزدی جو کہ ایک شیعہ عالم تھا اور جونپور کا قاضی بھی اس نے قرآن کو ہاتھ میں لے کر لوگوں کو یہ حکم دیا کہ وہ اکبر جیسے بدعتی حکمراں کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیں۔ اس سلسلے میں بہار کی اشرافیہ کا بھی بڑا دخل تھا مثلاً محمد معصوم کابلی، عرب بہادر، سعید بیگ بخشی، میر معیز الملک، سانجی خان، نیابت خان، سعادت علی، حاجی کلابی، سعید بدخشی، بہادر بدخشی، درویش علی سنجر اور کئی دوسرے اس میں پیش پیش تھے۔

دراصل ان امراء کو شاہی افسروں نے بے حد زچ کیا تھا۔ مثال کے طور پر ملاّ طیب، اور رائے پُرشتم بخشی کو جنہیں مالیانے کی وصولی کے سلسلے میں کافی تنگ کیا گیا تھا۔ لیکن شہنشاہ کی جانب سے مذہبی اختراعات اور شہنشاہ کے خلاف ملاّ محمد یزدی کے فتویٰ نے انہیں وہ موقع فراہم کیا جو اس کے خلاف بغاوت پھیلانے میں معاون ثابت ہوا۔ (24)

اکبر تاہم اب بھی اپنے معاملات میں مصروف تھا۔ بیربل اسے سورج دیوتا کے اسرار و رموز سکھانے میں لگا ہوا تھا کہ یہ سورج ہی ہے جو اناج اور پھل کو پکنے میں مدد دیتا ہے۔ ہریالی، روشنی اور زندگی کی موجودگی بھی اسی کی مرہونِ منت ہیں۔ اسی لئے سورج احترام کے لائق ہے۔ عبادت کے وقت لازم ہے کہ اپنا چہرہ اس جانب کیا جائے جہاں سے سورج طلوع ہوتا ہے یعنی مغرب کے بجائے مشرق کی جانب اس کا مطلب تھا کہ عبادت کعبۃ اللہ کی مخالف سمت میں کی جائے۔ (25)
اکبر نے آگ، پانی اور چند مخصوص درختوں اور پتھروں کو دیوتاؤں کا درجہ دے دیا۔ گائے، گوبر اور تلک جو ہندوؤں کا مخصوص نشان ہے وہ سب مقدس قرار پائے۔ یہاں تک کہ Janev کو بھی مقدس گردانا گیا جسے ہندو ایک مقدس دھاگے کے طور پر اپنی کمر اور بازو کے گرد لٹکاتے ہیں۔ (26)

بیربل کی گفتگو نے آہستہ آہستہ اکبر کو مائل کرلیا کہ وہ سورج اور سیارچوں کو دیوتاؤں کا درجہ دیدے اور پھر شمسی کیلنڈر کی بنیاد پر سال کا نیا دن منانے کو اہم قرار دے۔ اکبر نے مختلف رنگوں کے لباس پہننا شروع کر دیئے۔ ہر روز کا ایک مخصوص رنگ اس دن کے معمولات کو طے کیا کرتا۔ اس نے ''گائتری'' کو دہرانا شروع کر دیا تھا جو سورج کی پوجا سے متعلق ہے، اور یہ پوجا وہ آدھی رات اور علی الصبح کیا کرتا۔ (27)

1580 کے سالِ نور کے دن اکبر نے سرعام سورج اور آگ کے سامنے جھکنے کی رسم ادا کی۔ شام کے وقت جب شمعیں روشن کی گئیں تو درباریوں کو ان کے سامنے تعظیم کے ساتھ کھڑا رہنا پڑا۔ سورج کے Virgo میں چلے جانے کے بعد آٹھویں دن جو تہوار منایا جاتا ہے اکبر اس دن اپنے ماتھے پر تلک لگا کر محل میں داخل ہوا اور برہمنوں نے بڑے اہتمام کے ساتھ اس کے بازو پر راکھی باندھنے کی رسم ادا کی۔ (28) بیربل کے حلقہ اثر میں ہونے کے باعث اب وہ گائے کی قربانی کو بھی ناپسند کرنے لگا تھا۔ (29) برہمن اور پارسی اس قدر بااثر ہو چکے تھے۔

لیکن کچھ مسلمان مذہبی رہنما جن کا خصوصاً شیعہ فقہ سے تعلق تھا اب بھی اکبر کو پیغمبر بنانے کی کارروائی میں مصروف تھے۔ انہوں نے اعلان کیا کہ عالم پناہ بے شک ایک ایسے ''اپنے وقت کے دینی عالم'' ہیں جن کے ظہور کے لئے برسوں سے دنیا منتظر ہے کہ وہ آئیں اور مسلمانوں اور ہندوؤں کے 72 فرقوں کو ختم کر دیں۔ (30) شریف امولی (Sharif Amuli) نے اپنے مقالے میں محمود بخوانی (Mahmud Basakhwani) کی شہادت کا ذکر کیا ہے جس میں ایک ایسے مہدی کی آمد (31) کا ذکر کیا تھا جو 990 ہجری میں آئے گا اور منافقوں کا قلع قمع کر دے گا۔ خواجہ مولانا شیرازی جعفردان مکہ مکرمہ سے ایک ایسا مقالہ ڈھونڈ لائے جسے کئی ایک شیخوں نے مل کر تحریر کیا تھا اور وہ بھی اسی قسم کے واقعات کی پیشین گوئی سے بھرا تھا۔ اس مقالے کے مطابق دنیا کی عمر جو 7000 سال بتائی جاتی تھی اور اب اپنے خاتمے کے قریب تھی یہی وہ وقت جب مہدی علیہ السلام کے ظہور میں آنے کی توقع ہے۔ خواجہ مولانا شیرازی جعفردان نے بھی اسی موضوع پر ایک مقالہ تحریر کیا اور شہنشاہ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ اسی طرح دوسرے شیعہ علماء نے بھی حضرت علی کے حوالے سے کچھ اسی قسم کی باتیں کیں۔ ان میں سے کچھ علماء نے اسی موضوع پر ایک ایسی رباعی ڈھونڈ نکالی جو بقول ان کے ناصر خصرو نے تحریر کی تھی جو ایک

اسماعیلی داعی (Dai) تھا:

''نوسونواسی میں، آسمانی حکمنامے کے مطابق
ستارے ایک ایسی قطار میں صف آراء ہوں گے کہ
ستارہ اسد کے سال، ستارہ اسد کے ماہ، اور ستارہ اسد کے دن
خدا کا شیر پردے کے پیچھے سے ظہور پذیر ہوگا۔''(32)

پیغمبری کی سند عطا کرنے والے ان علماء کی جو کوئی بھی مخالفت کرتا وہ شاہی غصب سے محفوظ نہیں رہتا۔ حکیم الملک نے ان کی مخالفت کی کوشش کی اور ابوالفضل (بابائے علم) کو فضلاء کے نام سے پکارا تو اکبر نے اسے مکہ روانہ کر دیا۔ (33)

اسی سال گووا (Goa) سے پہلا مسیحی مشن اکبر کے دربار پہنچا اور عیسائی پادری نے مقدس تثلیث (Holy Trinity) کے رموز کی وضاحت پیش کی۔ شہزادہ مراد کو ان کے پاس بائبل پڑھنے کے لئے مقرر کیا گیا اور ابوالفضل کو حکم دیا گیا کہ وہ بائبل کا فارسی میں ترجمہ کریں۔ اکبر نے نہ صرف بائبل کا احترام کیا بلکہ حضرت عیسیٰ اور حضرت مریم کی تصویروں کا بھی احترام کیا۔ یہ اقدام ایسا ہی تھا جیسے کسی شبیہ کی پوجا کی جائے اور جو مذہب اسلام میں سختی سے ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ (34) یہی نہیں بلکہ عیسائی راہب کافی حد تک بدزبان بھی ثابت ہوئے۔ وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخانہ الفاظ استعمال کرتے (35) اور انہیں حضرت عیسیٰ کے مخالفین میں گردانتے۔ (36)

اکبر نے مسلم علماء کے ضبط و تحمل کا حد سے زیادہ ہی فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تھی۔ ان کے پیغمبر کی شان میں گستاخی کی گئی تھی، ان کے مذہب کا مذاق اڑایا گیا تھا، ان کی مقدس مذہبی کتاب کی بے حرمتی کی گئی تھی اور خود ان کا بھی مذاق اڑایا گیا تھا۔ یہ اب بالکل ناقابل برداشت ہو چکا تھا۔ وہ ابوالفضل اور اس کے ساتھیوں پر لعن طعن بھیجتے، بیربل کو برا بھلا کہتے (37) اور حضرت عیسیٰ کو بھی نہیں بخشتے۔

بنگال میں بغاوت

جو کچھ شاہی محل میں ہو رہا تھا وہ وہیں تک محدود نہ تھا۔ خبر مختلف صوبوں تک بھی پہنچ گئی۔ بہار

پہلے ہی ہتھیار اٹھا چکا تھا۔ بنگال میں مظفر خان جو کہ شاہی گورنر تھا ترکمانی امراء کو ٹیکس کی ادائیگی کے سلسلے میں مسلسل تنگ کر رہا تھا۔ اب ان کے پاس شاہی محل میں رائج نئے اسلام کی خبر پہنچ گئی۔(38) انہوں نے اپنے ہم خیال لوگوں کی محفل بلائی اور متفقہ فیصلہ کیا کہ وہ ترکمان جنرل بابا خان قاقشل کی رہنمائی میں علم بغاوت بلند کر دیں گے۔(39)

بہار میں شہنشاہ کی عملداری ختم ہو چکی تھی۔ اکبر کی وفادار فوج کو شکست ہو چکی تھی اور اس کے نامزد کردہ بخشی اور رائے پروشوتم (Rai Purushottam) کو موت کے گھاٹ اتارا جا چکا تھا۔(40) بہار میں باغی رہنما بابا خان اور معصوم خان کابلی آپس میں خط و کتابت کرنے میں لگے تھے۔ بہت جلد ان میں مفاہمت ہو گئی اور بہار کی فوجیں بنگال کے ترکمانوں کے ساتھ جا ملیں۔ ان دونوں فوجوں نے مل کر مظفر خان کے خلاف پیش قدمی شروع کر دی اور اسے ٹنڈا کے قلعے میں محصور کر کے رکھ دیا۔ جلد ہی قلعے پر قبضہ ہو گیا اور مظفر خان کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ اب بنگال اور بہار باغیوں کے کنٹرول میں تھا۔(41)

نہایت ہی شاندار طریقے سے سجائے گئے ان خیموں میں جو اکبر اعظم کے لئے لگائے جاتے باغی سرداروں نے آپس میں ملاقات کی اور اکبر کے بھائی مرزا حکیم کو ہندوستان کا شہنشاہ چن لیا۔ اسے ہندوستان پر شمال مشرق کی جانب سے حملہ کرنے کی دعوت دی جا چکی تھی۔ اس کی غیر موجودگی میں اس کے وکیل معصوم خان کابلی کو خانِ دوراں کا خطاب دیا جا چکا تھا۔ بابا خان قاقشل کو بنگال کا گورنر مقرر کیا گیا تھا اور اسے خانِ خاناں کا لقب بھی عطا کیا گیا تھا جبکہ اس کا بھتیجا جباری جو مجنوں خان کا بیٹا تھا خانِ جہاں اور پنج ہزاری بن گیا۔ وزیر جمیل کو خان زمان کا خطاب دیا گیا اور ترک بیگی کا دفتر بھی عنایت کیا گیا۔ خالدین کو اعظم خان، مرزا بیگ بطور بہادر خان، اور جان محمد بھسودی کو خانِ عالم کے خطابات سے نوازا گیا۔ بہار کا ایک اور باغی لیڈر عرب بہادر کو شجاعت خان کے خطاب سے نوازا گیا۔(42) بنیادی کمان معصوم خان کابلی اور بابا خان قاقشل کے ہاتھوں میں مرکوز تھی لیکن ان کی اس حیثیت کو کسی شاہی خاندان سے منسلک کرنے کے لئے انہوں نے اکبر کے داماد مرزا شرف الدین حسین کو اپنا سپریم کمانڈر بنا لیا۔(43)

بہار کے باغیوں سے نمٹنے کے لئے اکبر نے راجہ ٹوڈرمل کو روانہ کیا اور ان تمام امراء کو جو شہنشاہ کے وفادار تھے اس سے تعاون کرنے کا حکم صادر کیا گیا۔(44) جونپور کا گورنر معصوم خاں

فرخندی اپنی تین ہزار تربیت یافتہ فوج کے ساتھ اس کے ساتھ شامل ہو گیا لیکن اس کے ذہن میں کوئی سازش پلتی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔(45) ہمایوں فرمولی جو شہنشاہ کی جانب سے کئے گئے مسلم عقائد کی بے حرمتی کے مناظر دیکھ چکا تھا(46) راجہ ٹوڈرمل کی فوج کو چھوڑ کر دشمنوں سے جا ملا اور ترکمان دیوانہ نے بھی ایسا ہی کیا۔(47)

شہنشاہ کو پل پل کی خبر پہنچ رہی تھی اور اسے صورتحال کی سنگینی کا بے حد اندازہ تھا۔(48) مرزا عزیر کوکا کو دفتر سے خارج کر دیا گیا تھا اور اس کے تمام عہدے اور القابات چھین لئے گئے تھے اور اسے اپنے گھر اور باغ کی چار دیواری میں نظر بند کر دیا گیا تھا۔اس کا جرم یہ تھا کہ اس نے گھوڑوں کو نشان لگانے والے قانون کی مخالفت کی تھی اگرچہ کہ اس کی وفاداری شک سے بالاتر تھی۔اکبر نے بعد ازاں اسے اس کے عہدے پر بحال کر دیا اور بنگال کا گورنر مقرر کرتے ہوئے خلعت فاخرہ بھی دی اور مشرق میں بغاوت کچلنے کی مہم پر روانہ کر دیا۔(49)

شہباز خان جو کہ نہایت دلیر جنرل تھا اور رانا کے ساتھ نبرد آزما تھا اسے میواڑ واپس بلوا کر ان باغیوں کے خلاف روانہ کیا گیا۔(50)

ان تمام کارروائیوں کے بعد اکبر کے غیض وغضب کا نشانہ مذہبی علماء بنے۔ملا محمد یزدی اور میر معز الملک کو جونپور سے روانہ کیا گیا۔جب وہ آگرہ سے پچاس میل دور فیروز آباد پہنچے تو حکم دیا گیا کہ انہیں ان کے محافظ سپاہیوں سے علیحدہ کر کے بذریعہ کشتی جمنا کے راستے گوالیار لے جایا جائے۔بعد میں دوسرا فرمان ان کے خاتمے کے سلسلے میں جاری کر دیا گیا۔ان کے محافظ سپاہی ایک کشتی میں بیٹھے اور ان دونوں کو دوسری کشتی میں سوار کیا گیا۔دریا کے بیچ میں پہنچ کر ان کی کشتی ڈبو دی گئی۔اس کے فوراً بعد قاضی یعقوب بنگال سے آیا اور اسے بھی ایسے ہی سفر پر روانہ کر دیا گیا۔ایک کے بعد ایک مشتبہ مولویوں کو موت کی وادی میں روانہ کیا جاتا رہا۔(51)

لاہور میں ملاؤں کا زور ختم کرنے کے لئے انہیں پورے ملک میں پھیلا دیا گیا۔انہیں دور دراز کے غیر معروف علاقوں میں تعین کر دیا گیا جو ملک بدر کرنے سے کسی طرح کم نہ تھا۔قاضی صدرالدین لاہوری کو گجرات کے علاقے برائچ (Baraich) کا قاضی بنا کر روانہ کیا گیا۔ملا عبدالشکور کو جونپور کا قاضی نامزد کیا گیا جبکہ ملا محمد معصوم کو بہار کا رخ کرنے کے لئے کہا گیا۔شیخ منور مالوہ کے صدر مقرر کئے گئے اور دوسرے کئی ایک مولوی بھی کم وبیش ایسے ہی حالات کا شکار

ہوئے۔حاجی ابراہیم سرہندی کو دربار سے نکال کر گجرات کا صدر بنا دیا گیا۔(52)

اکبر کا اگلا نشانہ مشائخ تھے۔وہ جاننا چاہتا تھا کہ علماء اور مشائخ کیا واقعی انہی صلاحیتوں کے مالک تھے جس کا وہ دعویٰ کرتے تھے اور جو انہیں سرکاری جاگیریں کرائے کی ادائیگی کے بغیر رکھنے کا احترا ز بناتی ہے؟ یہی نہیں بلکہ اس کا مشائخ کے بارے میں یہ عقیدہ بھی بہت کمزور پڑ چکا تھا کہ وہ لوگوں کی روحانی طور پر رہنمائی کر سکتے ہیں۔اس نے ان میں سے کئی ایک کی صلاحیتوں کا جائزہ لیا تھا اور انہیں اس صلاحیت سے عاری پایا تھا۔اس کے باوجود وہ اپنے معتقدین کی کثیر تعداد رکھتے تھے اور انہیں اثر ورسوخ کے لئے استعمال کرتے تھے۔اکبر ان مشائخ کے اس اثر کو ختم کرنا چاہتا تھا جو جھوٹ اور فریب پر مبنی تھا۔اس نے ملک کے تمام علماء اور مشائخ کو دربار میں حاضر ہونے کا حکم دیا۔شہنشاہ خود ان سے انٹرویو کرتا اور یہ فیصلہ کرتا کہ اس کو کتنی جاگیر سرکاری طور پر دی جانی چاہیئے۔تقریباً ہر ایک شیخ اور عالم کی جاگیر کا رقبہ مختصر ہوتا چلا گیا لیکن ان مشائخ، علماء اور ولیوں کو جنہوں نے موسیقی کی محافل سجائیں اور مختلف معجزاتی چالبازیوں سے کام لیا فوراً جیل بھیج دیا گیا یا بنگال یا بھکر کی طرف روانہ کر دیا گیا۔(53)

لیکن شاہی ولی اللہ خود اپنے عقیدت مندوں سے مکمل وفاداری کا متمنی تھا۔جب اکبر کے شب و روز نہایت مذہبی بلکہ کسی ولی اللہ کے طرز پر گزر رہے تھے تو لوگ اس کو اپنا ''پیر و مرشد'' مانتے تھے اور اس کے مرید بننے کے لئے اس سے بیعت کیا کرتے تھے۔اب جبکہ اس نے کئی ایک مذہبی اختراعات کو اپنے اعتقاد کا حصہ بنا لیا تھا تو اس کی ''پیر و مرشد'' والی حیثیت کافی دھندلا کر رہ گئی تھی۔اس کے نئے تصورات کے ماننے والوں کی تعداد محض درجن بھر رہ گئی۔ان میں سب سے نمایاں بیربل اور ابوالفضل تھے جو مذہباً برہمن اور ملاّ کے بیٹے تھے۔ابوالفضل صحیح معنوں میں ایک ''جی حضوری'' شخص تھا اور اپنی چاپلوسیوں کی بدولت دربار میں اہم مقام رکھتا تھا۔اس قسم کے لوگ تھے جو ابھی تک خود کو شہنشاہ کا مرید کہتے اور اکبر کو اپنا پیر و مرشد مانتے تھے۔ان جیسے مصاحبوں کے لئے اکبر نے چار خصوصی مرتبے تشکیل دیئے جو ان وفاداروں کی سنجیدگی جانچنے کا پیمانہ بھی تھے۔سب سے نچلا درجہ ان اشخاص کا تھا جو اپنے اس مذہبی حاکم کے لئے اپنی مال و متاع نچھاور کرنے کے لئے تیار تھے اس کے بعد وہ لوگ آتے تھے جو اپنی زندگی بھی قربان کرنے کے لئے تیار ہوں۔ان سے اعلیٰ وہ قرار دیئے گئے جو

اپنی عزت اور حیثیت بھی قربان کرنے کے لئے آمادہ ہوں۔ سب سے اعلیٰ مرتبہ ان کا ٹھہرا جو نہ صرف اپنا مال ومتاع، زندگی اور عزت کی بازی لگانے کو تیار ہوں بلکہ اپنا مذہب تبدیل کرنے میں بھی عار محسوس نہ کرتے ہوں۔ (54) وفاداری اور سنجیدگی کا مطالبہ اس وقت کیا جاتا جب اس کی سخت ضرورت ہو۔

اکبر نے اپنے تین اہم جنرلوں کو محاذ جنگ پر بھیجا تھا۔ ایک نہایت ہوشیار، دوسرا بے حد وفادار اور تیسرا نہایت جنگجو تھا لیکن وہ خود دارالخلافے میں ہی موجود رہا۔ اسے توقع تھی کہ حکیم شمال مشرق کی جانب سے حملہ کرے گا۔ (55) وہ اس بات کے لئے تیار تھا کہ پیش قدمی کر کے پنجاب میں اپنے دشمن کا مقابلہ کرنے کے بجائے اس کے کہ مشرقی محاذ پر روانہ ہو کر دشمن کو دارالخلافے پر حملہ کرنے کا موقع دے۔

مشرق میں موجود باغی عام لوگ نہ تھے۔ طاقتور ترین امراء مشرقی صوبوں میں اس کے خلاف بغاوت پر آمادہ ہو چکے تھے اور اس مقصد کے لئے مذہب اور اس کے ہم پلہ شاہی خاندان کے ایک فرد کو استعمال کر رہے تھے۔ محلاتی سازشیں بھی آہستہ آہستہ سر اٹھا رہی تھیں اور عوام الناس میں موجود اہم افراد بھی اس میں شامل ہو رہے تھے۔ انہیں مطلوبہ نتائج حاصل ہونے کا مکمل یقین نہ تھا۔ اس لئے وہ ظاہری وفاداری کے لئے مجبور تھے جبکہ وہ اندرونی طور پر اس کے مخالف تھے۔ حکومت کے مخالف تمام لوگوں نے مشرقی علاقے میں ایک گٹھ جوڑ بنا لیا تھا، اور وہ کابل حکومت سے رابطے میں بھی تھے۔ روشن بیگ کو کابل سے بنگال میں بغاوت پھیلانے کی غرض سے بھیجا جا چکا تھا۔ (56) جونپور کے قاضی ملا محمد یزدی پہلے ہی یہ فتویٰ دے چکے تھے کہ اکبر کے خلاف جنگ کرنا ہر مسلمان کی ذمہ داری ہے۔ مذہبی طبقے سے ایک اور اہم فرد میر معیز الملک بھی اس کا حامی تھا۔ بنگال کا قاضی یعقوب جو ایک سرکاری قاضی تھا وہ بھی ان کے ساتھ شامل ہو گیا تھا۔ شاہی افواج کے ہمایوں فرمولی اور ترکمان دیوانہ بھی شاہ کے حامی ٹوڈرمل سے مذہب کے نام پر علیحدہ ہو گئے تھے۔ بہت سے دوسرے امراء کا رویہ بھی کسی حد تک باغیانہ ہوا جا رہا تھا۔ ان میں اہم ترین جونپور کا گورنر معصوم خان فرنا خدی، مرزا علی عالم شاہی، مرکی، ادی، شہاب بخشی اور کوچک یساول بھی مشرق کی جانب فرار اختیار کرنے کے لئے پر تول رہے تھے۔ میر علی اکبر نے ان کا مشترکہ پیغام آگے بھیج کر ان کو مدد فراہم کی تھی اور

اس کی بے لگام گفتگو بھی جلتی پر تیل کا کام کر رہی تھی۔(57)

اکبر عوام کو غیر مشتعل ہونے سے روکنے کے لئے مصروف کار تھا۔ پچھلے سال اجمیر شریف کی زیارت سے واپسی پر اکبر نے یہ حکم دیا تھا کہ شاہی دستے کے ہمراہ ایک خیمہ مسجد ضرور رہنی چاہئے جس میں وہ روزانہ پانچ وقت کی نماز لوگوں کے ساتھ ادا کرے گا۔ اس سال شہزادہ دانیال کو اجمیر شریف زیارت کے لئے پانچ ہزار دے کر روانہ کیا گیا تا کہ وہاں موجود لوگوں میں وہ رقم بانٹ دی جائے۔(59)

نہ صرف شہباز کو رانا کے خاف مہم سے واپس بلوالیا گیا تھا بلکہ مالوہ اور گجرات سے بھی جنرلوں کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ دکن کی شورشوں کو قابو میں لائیں اور اس کے مزید احکامات کا انتظار کریں۔ مالوہ کا گورنر شجاعت خان خاص اسی مقصد کے لئے روانہ کیا گیا تھا۔(60) ان واقعات سے صورتحال کی سنگینی کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔

محلاتی سازش

باغیوں کے خلاف لڑائی کے دوران شاہی وزیر خزانہ خواجہ شاہ منصور نے ترسون محمد خان (Tarsun Mohammad Khan) اور معصوم خان فرنخودی سے بقایا جات کی ادائیگی کے لئے سخت شرائط کے ساتھ مطالبہ کر دیا۔ معصوم خان کی وفاداریاں پہلے ہی کمزور پڑ رہی تھیں اور ترسون محمد خان کا مشرقی صوبوں میں اہم ترین شاہ پرستوں میں شمار ہوتا تھا جو حکومت کے مفاد میں وہاں نبرد آزما تھا۔ بجائے اس کے کہ میدانِ جنگ میں اپنی زندگی خطرے میں ڈالنے کے صلے میں حوصلہ افزائی اور پذیرائی کی جاتی اس کی سرزنش کی جا رہی تھی۔(61) یہ ایک ایسی کوشش تھی جو انہیں دشمنوں کی طرف دھکیلنے کا بہترین ذریعہ بن سکتی تھی۔

شاہ منصور نے یہ قدم خصوصاً ان حالات ہے کسی خاص مقصد کی خاطر اٹھایا ہو۔ لیکن ابوالفضل نے اس موضوع پر محض اتنا ہی تحریر کیا ہے: ''میں اس مطالبہ کا کیا مطلب سمجھوں؟ اور یہ کہ اس غیر مناسب مطالبہ کرنے والے کو کس فریق کا ہمدرد سمجھوں؟''(62) یہ سوالات اس وقت کے حالات کے بارے میں ایک اہم نقطہ نظر فراہم کرتے ہیں اور ایسے فریق کی موجودگی کا اظہار کرتے ہیں جس کی وفاداری مشکوک ہے۔ اکبر کو واقعی اپنے وزیر خزانہ پر شک تھا اور اس

نے فوراً اس کو وزارت سے معطل کر کے جیل میں ڈال دیا۔ (63)

شہنشاہ ان دنوں سخت ذہنی دباؤ کا شکار تھا۔ وہ محلاتی سازشوں پر نظر جمائے ہوئے تھا اور مغربی محاذ سے کسی اچھی خبر کا متمنی بھی تھا۔ کبھی وہ باغیوں کو ان کے اقدام پر معاف کرتا دکھائی دیتا ہے کیونکہ تمام تر احکامات جاری ہو چکے تھے اور قسمت کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ شر پسندوں کی تباہی اور وفاداروں کی بے وفائی بھی پہلے ہی صاف دکھائی دے رہی تھی۔ (64)

جب باغیوں کے منگر (Munger) سے محاصرہ ختم کرنے اور بھاگ کھڑے ہونے کی خبر دارالخلافے میں پہنچی تو مذہبی شہنشاہ نے خدا اور اس کی مدد کی تعریف تہہ دل سے اور احساسِ ندامت سے کی۔ وہ خوشی کے لمحات میں اپنے معبود کی تعریف اور عبادت کیا کرتا تھا۔ (65)

لیکن بغاوت ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ اکبر نے اپنے خدا سے یہ عہد کیا تھا کہ اگر بغاوت ناکام ہوگئی تو وہ اور اس کے تمام درباری شکرانے کے طور پر 12 سال تک کوئی جانور ہلاک نہیں کریں گے۔ (66)

1581 کے ابتداء میں یہ اطلاع ملی کہ مرزا حکیم نے اپنا محافظ دستہ شادمان کی سربراہی میں دریائے سندھ کے پار بھیجا تھا جسے مان سنگھ نے پسپا کر دیا تھا۔ اکبر نے اسے خصوصی ہدایت بھیجی تھی کہ وہ فوراً سیالکوٹ کی جانب پیش قدمی کرے اور سرحدوں کا انتظام سنبھالے۔

اکبر نے رائے رائے سنگھ، جگن ناتھ، راج گوپال اور کئی دوسرے جنرلوں کو لاتعداد ہاتھیوں کے ساتھ لاہور کی جانب روانہ کیا لیکن اس کے ساتھ ہی سرحدی جنرلوں کو حکم دیا کہ وہ مرزا حکیم کو دریائے سندھ عبور کر کے پنجاب میں داخل ہونے دیں۔ (67)

شہنشاہ اب اپنے حملہ آور بھائی سے مقابلہ کرنے کے لئے تیار تھا۔ جبکہ سلطان خواجہ، شاہ قلی محرم، اور شیخ ابراہیم شہزادہ دانیال کی سربراہی میں دارالخلافے کی حفاظت پر مامور کئے گئے تھے۔ اپنے دو بیٹوں شہزادہ سلیم اور شہزادہ مراد کو ساتھ لے کر وہ فتح پور سے میدانِ جنگ کی طرف اپنی اس فوج کو لے کر روانہ ہوا جسے آٹھ ماہ کی تنخواہ پیشگی ادا کر دی گئی تھی۔ (68)

چند دنوں میں وہ دہلی پہنچ گیا جہاں اس نے اپنے پرانے معبودوں یعنی کٹر صوفیاء کرام کے مقبروں پر حاضری دی (70) غالباً اپنی دعایا کی خوشنودی کے لئے۔

شاہ منصور کو دو غلے کردار کی وجہ سے جیل میں ڈال دیا گیا لیکن جب اس کے جانشین

وزیرستان کو اودھ کا گورنر بنا کر بھیجنا پڑا تو اس کی وزارت دوبارہ بحال کر دی گئی۔ (71)

شادمان جو مرزا حکیم کا جنرل تھا مان سنگھ سے لڑتا ہوا مارا گیا۔ اس کے ذاتی سامان میں مرزا حکیم کے تحریر کردہ تین خطوط دریافت ہوئے جنہیں مان سنگھ نے شہنشاہ کی طرف بھیج دیا۔ ان میں سے ایک خط خواجہ شاہ منصور کے نام تھا جس میں اس کی وفاداریوں اور تعاون کو سراہا گیا تھا اور انعام واکرام کی یقین دہانی بھی کرائی گئی تھی۔ اکبر نے مصلحتاً اس وقت خاموشی اختیار کرنا ضروری سمجھا۔ (72)

اکبر پنجاب کی طرف پیش قدمی کرتے ہوئے جب سونی پت (Sonipat) پہنچا تو مرزا حکیم کا دیوان ملک ثانی (73) اس کے خیمے میں آیا جو کہ شاہ منصور کے خیمے کے ساتھ ہی تھا اور اپنی خدمات اکبر کے لئے پیش کیں۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ مرزا کے ہاتھوں اسے کس قدر مصیبتیں جھیلنی پڑی ہیں کہ اس کے پاس مرزا سے راہ فرار اختیار کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔ اس واقعے کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ محض ایک چال تھی کہ اسے کسی طرح اکبر کے دربار تک رسائی حاصل کرائی جائے تاکہ وہ درباریوں کو ورغلانے کا کام کر سکے اور شیطانی سازشیں جلد کامیاب ہو سکیں۔ (74) اکبر نے ملک ثانی کو جیل میں ڈال دیا تو خواجہ منصور نے اس کی مخالفت کی۔ دربار میں خواجہ منصور کے اس اقدام پر شور بپا ہو گیا۔ اکبر کے خواجہ منصور سے متعلق شکوک وشبہات کو اس واقعے نے مزید تقویت بخشی۔ نتیجتاً اسے بھی جیل بھیج دیا گیا۔ (75)

چند روز بعد چند اور خطوط اکبر تک پہنچائے گئے جن میں خواجہ پر الزام لگایا گیا تھا۔ انہیں دیکھ کر شہنشاہ اکبر نے شاہ منصور کو حکم دیا کہ وہ اپنی وفاداری کا کوئی اچھا ثبوت فراہم کرے یا مرنے کے لئے تیار ہو جائے تاکہ وہ ان لوگوں کے لئے عبرت اور سبق بن جائے جو اپنی کوتاہ بینی اور لالچ کے پیش نظر سازشوں کا جال بن رہے ہیں۔ (76) شاہ منصور ایسی کوئی ضمانت اور ثبوت فراہم کرنے سے محروم رہا اور شہنشاہ نے اسے درخت سے لٹکا کر پھانسی دینے کا حکم صادر کر دیا کیونکہ وہ ایک افراتفری کا دور تھا کوتاہ بینوں اور شیطانی سازشیوں نے حالات کو نہایت پیچیدہ اور سنگین بنا دیا تھا۔ کینہ پروری بے لگام ہوتی جا رہی تھی۔ (77)

وہ خطوط جو شاہ منصور کی تباہی کا باعث بنے ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ کرم اللہ اور چند دوسرے درباریوں کی چالبازی کا نتیجہ تھے۔ (78) لیکن ''شیطانی سازشوں''، ''کوتاہ بینوں

اور لالچیوں''، ''کینہ پروری کی بے لگامی'' اور ''افراتفری کا دور'' کا تذکرہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ بغاوت اور سازشیں اپنے عروج پر تھیں۔

خطوط کا دوسرا سیٹ جو شاہ منصور کی موت کا باعث بنا ہوسکتا ہے کہ وہ اس کے دشمنوں کی کارستانی ہو محض اس لئے نہیں کہ ان کے بارے میں اس وقت کے معتبر تاریخ نویس مثلاً نظام الدین احمد اور بدایونی نے ایسا اظہارِ خیال کیا ہے بلکہ جس طرح وہ خطوط اکبر تک پہنچائے گئے وہ شاہی چالبازیوں کا شاخسانہ دکھائی دیتے ہیں۔ ملک علی ان خطوط کو دربار میں پیش کرنے لایا تھا اور اس نے جو کہانی سنائی وہ کچھ یوں تھی کہ اس کے آدمی جب کشتی میں لدھیانہ سے آرہے تھے تو انہیں سرہند کی سرائے میں ایک پیغام رساں ملا تھا جس کے پیر سوجے ہوئے تھے۔ (یاد رہے یہ کشتی ملک علی کے زیرانتظام تھی) اس پیغام رساں نے اس کے آدمیوں کو بتایا کہ وہ شاہ بیگ کا ملازم ہے جو خواجہ شاہ منصور کا خدمتگار ہے اور اس کی لاہور سے تیس کوس دور فیروز پور میں جاگیروں کی دیکھ بھال کے لئے ''نقدار'' کی حیثیت سے کام کرتا ہے۔ مزید یہ بھی بتایا کہ شاہ بیگ نے اسے چند خطوط خواجہ شاہ منصور کے لئے دیئے ہیں لیکن وہ اپنی ٹانگوں کی سوجن کے باعث مجبور ہے کہ وہ ان خطوط کو شاہ منصور تک پہنچادیں۔ ملک علی نے شہنشاہ کو بتایا کہ اس کے آدمی یہ خطوط گھر لے آئے اور جب انہوں نے سیل کھول کر دیکھا تو یہ باغیانہ دستاویزات ان کے سامنے آگئیں۔ (80)

پورا واقع ایک ناقابل یقین من گھڑت کہانی دکھائی دیتا ہے۔ لیکن اس وقت کے سیاسی بحران کے پیش نظر اور خود اکبر کے ذہنی دباؤ والی کیفیت کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس نے واقعی اس کہانی پر یقین کرلیا ہوگا اور شاہ منصور کو پھانسی پر چڑھانے کا حکم دیدیا ہوگا۔

کرم اللہ اور اس کے حواریوں نے یہ موقع بے حد غنیمت جانا ہوگا کہ وہ اس قسم کی سازش کے ذریعے اس آدمی کو باآسانی ٹھکانے لگا سکتے ہیں جس سے وہ نفرت کرتے تھے۔ شاہ منصور پہلے ہی کافی مواقع فراہم کرچکا تھا جو اس کو مشکوک بناتے تھے۔ سب سے پہلے جو خط ملا تھا اس کو آسانی سے رَد نہیں کیا جاسکتا۔ وہ حقیقت سے زیادہ قریب اور داستان گوئی سے بہت دور تھا۔ نظام الدین احمد اور بدایونی دونوں ہی تمام خطوط کو جعلی قرار دیتے ہیں (81) جو کسی حد تک تمام معاملات کو عمومی نقطہ نگاہ سے دیکھنے کی ایک کوشش دکھائی دیتی

ہے۔ کیونکہ درحقیقت دوسری مرتبہ جو خطوط منظر عام پر آئے تھے ان کی صحت پر کافی شک ہوتا ہے۔ مزید یہ کہ خود وہ بھی دوسری مرتبہ ملنے والے خطوط کے جعلی ہونے پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ (82)

اگر پہلے ملنے والے خطوط کو بھی جعلی سمجھ لیا جائے تو دو گتھیاں سلجھانا مشکل ہو جاتی ہیں۔ پہلے خطوط مرزا حکیم کے سیکریٹری کے ہاتھ سے لکھے گئے تھے۔ (83) کرم اللہ نے مرزا حکیم سے تعلقات کیسے اور کن بنیادوں پر استوار کئے تھے؟ کیا مرزا حکیم کا سیکریٹری اس کے خلاف کام کر رہا تھا؟

کرم اللہ دراصل شہباز خان کا بھائی تھا جو ہندوستان میں شاہ کے وفاداروں میں شامل تھا۔ سیکریٹری نے کرم اللہ سے کیوں ایسی ساز باز کی جو شاہ منصور کی موت کا باعث بنی؟ اس کے علاوہ پہلے ملنے والے تمام خطوط شاہ منصور کے نام نہیں لکھے گئے تھے۔ تین میں سے دو خطوط قاسم خان میر بہر اور حکیم الملک گیلانی کے نام تھے۔ (84) کرم اللہ اور اس کے ساتھیوں کے لئے ان دو آدمیوں سے کیا پرخاش تھی؟ تاریخی ریکارڈ کے مطابق ان کی ان دونوں سے کوئی دشمنی نہ تھی۔ مزید یہ کہ حکیم الملک کو اکبر پہلے ہی ملک سے دور مکہ میں بھیج چکا تھا کیونکہ وہ نئی اسلامی ریاست کے خلاف تھا (85) اور یہ کہ جب اکبر نے اسے واپسی کی دعوت دی تو اس نے آنے سے انکار کر دیا تھا۔ (86) قاسم خان جبکہ خواجگی محمد حسین کا چھوٹا بھائی تھا جو مرزا حکیم کا بے حد معتبر آدمی تھا۔ (87)

اس کے علاوہ ابوالفضل کی جانب سے ان خطوط کے جعلی اور حقیقی ہونے کے بارے میں کوئی اظہارِ خیال نہ کرنا بڑا اہم ہے اور شاہ منصور کے بارے میں اس کے دو بیان کی اہمیت ہے: ''شاہ منصور یہ سمجھنے سے محروم رہا کہ مختصر زندگی میں جعلسازی کبھی بھی پائیدار نہیں ہوتی اور اگر اس کے دل میں اپنے خدا کا شکر کرنے کی کوئی صلاحیت ہوتی تو وہ اپنے بادشاہ سے سنجیدہ اور وفادار رہتا، لوگوں کے ساتھ ہمدردی سے پیش آتا اور لالچ کو منہ نہ لگاتا تو شہنشاہ کے غیض وغضب سے محفوظ رہتا۔'' (88)

شاہ منصور کا ذکر میں نے تفصیل سے اس لئے کیا کیونکہ یہ محلات میں ہونے والی سازش کو بے نقاب کرتا ہے، اور یہی سازش حالات کی سنگینی کی وضاحت کرتی ہے۔

پنجاب پر حملہ

مرزا حکیم دریائے سندھ عبور کر کے لاہور پہنچ جاتا ہے اور خود کو وہاں محصور کر لیتا ہے۔ سعید خان، راجہ بھگوان داس اور کنور مان سنگھ شہر میں موجود تھے لیکن اس کے خلاف کسی کارروائی سے محروم تھے کیونکہ انہیں ایسا کرنے سے منع کیا گیا تھا۔ ''وہ ہمہ وقت شہر کی حفاظت کرنے کے لئے مستعد اور چوکنے تھے اور انہوں نے شہر میں موجود اس بڑی پگڑی پہننے والے اور بیہودہ باتیں کرنے والے کو دشمنوں سے رابطہ کرنے سے روکا ہوا تھا۔''(89) یہ مختصر جملہ لاہور میں موجود اس مذہبی طبقے کی موجودگی کا پتہ دیتا ہے جو اکبر بادشاہ کے خلاف تھے اور اس کے بھائی کو خوش آمدید کہنے کے لئے تیار تھے۔ اس مذہبی طبقے کی موجودگی ایسے لوگوں کی موجودگی کا پتہ دیتی ہے جو ان سے متاثر تھے۔

سرہند سے اکبر نے ملک کے تمام صوبائی گورنروں، شقداروں اور دوسرے انتظامی افسروں کے نام یہ حکم نامہ روانہ کیا کہ وہ گاؤں گاؤں اور قریہ قریہ ہر ایک شخص کی تفصیلات تیار کریں کیا وہ اپنی گذر بسر کے لئے ایماندارانہ کاروبار میں مشغول ہیں۔ انہیں ان کے ذرائع آمدنی کا پتہ چلانا تھا اور ان کے اخراجات پر خاص نظر رکھنی تھی۔ اکبر کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ وہ ان مولویوں اور پیر و مریدوں کا پتہ چلا سکے جو عوام الناس سے اپنے مذہبی اثر و نفوذ کے ذریعے پیسہ کماتے ہیں۔(90)

اکبر کے مخالف مرزا حکیم نے اس دوران لاہور کا محاصرہ ختم کر کے کابل کی طرف جلدی سے نکل بھاگنے کی تیاری شروع کر دی۔ مہابلی اکبر کی لاہور آمد کی خبر اس کے لئے خوف کا سبب تھی۔ ستلج کو مچھی وارا (Machhiwara) کے قریب سے عبور کرتے ہوئے سرہند سے کلانور (Kalanur) اور راوی کو کلانور کے قریب سے عبور کرتے ہوئے وہ چناب کے قریب رام گڑھ اور پھر راولپنڈی کے قریب جہلم کو عبور کرتا ہوا اکبر دریائے سندھ کے کنارے پہنچ گیا۔ یہی علاقہ اس کی سلطنت کا شمال مغربی سرحد قرار پایا اور مستقبل کی پریشانیوں سے بچنے کے لئے اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اس دفاعی سرحد کو مزید مستحکم کرے۔ اس مقصد کے لئے اس نے یہاں ایک قلعہ تعمیر کرنے اور ایک طاقتور فوجی دستہ یہاں پر تعین کرنے کا فیصلہ کیا۔

اکبر کا یہ فیصلہ حالات کی سنگینی کا مظہر ہے جو حکیم کے حملے سے پیدا ہوئی تھی۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے قلعہ کی بنیاد رکھی اور اس قلعہ کا نام اٹک بنارس رکھا جو مشرق میں موجود اسی قسم کے دوسرے قلعہ کا ہم نام تھا جسے کٹک بنارس پکارا جاتا تھا۔ (91)

اکبر نے تہیہ کیا ہوا تھا کہ وہ خود اپنے بھائی کی سرزنش کرے گا کیونکہ دور بیٹھے ہوئے کوئی نصیحت کرنا اتنی موثر نہیں ہو سکتی تھی جتنی کہ آمنے سامنے بیٹھ کر نصیحت کی جائے۔ (92) اسی مقصد کی خاطر اس نے دریائے سندھ عبور کیا اور کابل کی جانب روانہ ہو گیا۔ ارادہ یہ تھا کہ وہ اسی طرح اپنی مکمل فتح کا اعلان کرے گا۔ لیکن اس کے امراء کابل کی جانب پیش قدمی کے لئے تیار نہ تھے اور اس کی ایک وجہ مرزا حکیم سے ان کی ہمدردی تھی۔ (93) اکبر نے ابوالفضل سے کہا کہ وہ ان امراء کی رائے کو ضبط تحریر میں لائے اور اس کے سامنے پیش کرے۔ (94)

ابوالفضل کے مطابق وہ کوئی ایسی مستند دلیل پیش نہ کر سکے جو ان کے اس فیصلے کی صحیح تائید اور ترجمانی کر سکے۔ اس کی ایک وجہ بقول اس کے یہ بھی تھی کہ ''اس کے بال سفید نہ تھے، اور نہ ہی لمبی داڑھی تھی، اور اس کا جبہ بھی بوڑھے منافقوں جیسا نہ تھا۔'' (95) یہاں وہ چند ایک ایسے امراء کی جانب اشارہ کرتا ہے جو دل سے شاہ کے وفادار نہ تھے۔

اکبر خود بھی کابل کی جانب پیش قدمی سے ہچکچا رہا تھا لیکن اس کی وجوہات کچھ اور تھیں۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کا بھائی توران کی جانب بھاگ نکلے۔ (96) اکبر کے مرتد ہونے کی خبر اس کی سلطنت سے باہر تک پہنچ چکی تھی۔ تورانی مذہبی معاملات میں بے حد پُر جوش واقع ہوئے تھے۔ ہمایوں کا ایک بیٹا توران کے ایک طاقتور بادشاہ عبداللہ خان ازبیک کی سرپرستی میں اس کے لئے سیاسی بساط میں کافی خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ اکبر چاہتا تھا کہ مرزا حکیم ان خطوط پر صلح کے لئے راضی ہو جائے جو اس نے طے کی تھیں لیکن اس کے لئے کابل پہنچنا بے حد ضروری تھا۔

اسے اپنے جنرلوں کی جانب سے مکمل تعاون کی یقین دہانی نہیں تھی اور یہ اس کے لئے ضروری تھا کہ وہ ان کی مکمل رضامندی یا ان کی اصل رائے حاصل کر سکے یا ان کے دل کا حال جان سکے اور یہ بھی جان سکے ان کے ارادے کیا ہیں۔ ایک مرتبہ پھر امراء کا مشترکہ اجلاس بلانے اور کارروائی کی تفصیل نوٹ کرنے کے لئے ابوالفضل کی ذمہ داری لگائی گئی لیکن اس

سے بھی کچھ فائدہ نہ ہو سکا۔ ابوالفضل کے علاوہ سب کی یہ متفقہ رائے تھی کہ مرزا حکیم کی شرائط مان لی جائیں اور واپس ہندوستان کی جانب لوٹ جائیں۔ اکبر کافی ناراض تھا اور اس کے لئے بھی تیار تھا کہ وہ اکیلا اپنے گارڈ اور لشکر سمیت نکل کھڑا ہو۔ امراء کو مجبوراً اس کے ساتھ جانا پڑے گا۔ (97)

شہنشاہ نے پہلے ہی ایک مضبوط فوج مان سنگھ، مرزا یوسف خان، رائے رائے سنگھ، کرم اللہ (شاہ منصور کے نقلی خطوط پیش کرنے والا)، سیّد حامد بخاری، مخصوص خان، قلیچ خان، نورنگ خان، مادھیو سنگھ کو شہزادہ مراد کی سربراہی میں روانہ کر دیا تھا۔ (98) لیکن مرزا حکیم بھی آسانی سے شکست ماننے والا نہیں تھا۔

اکبر کے امراء اور فوج کی غداریوں کی خبریں اور افواہیں اس قدر عام تھیں کہ ان سے یہ توقع کی جا رہی تھی کہ وہ عین میدانِ جنگ میں اپنی وفاداریاں تبدیل کر لیں گے۔ مرزا حکیم نے سمجھا کہ ان سب کو آزمایا جا سکتا ہے۔ اس مقصد کی خاطر اس نے جنگ سے قبل کچھ لوگوں کو توڑنے کی کوشش کی۔ قلیچ خان، مرزا یوسف خان، نورنگ خان، علی مراد اور چغتائی خاندان کے چند لوگوں کو خطوط بھیجے گئے اور ان سے وفاداریاں تبدیل کرنے کی توقع کی گئی اور انعام واکرام کے وعدے بھی کئے گئے۔ اکبر نے اپنی پیش قدمی کرنے والی فوج کا چناؤ نہایت ہوشیاری اور سمجھ بوجھ سے کیا تھا۔ قاسم خان اور اس کی قبیل کے دوسرے امراء کو ان میں شامل نہیں کیا گیا تھا، اور انہیں وہیں دریائے سندھ کے کنارے قیام کرنے کی ہدایت کی گئی تھی۔ مرزا یوسف خان نے خط کو پھاڑ کر پھینک دیا اور علی مراد نے پیغام رساں کو ہی موت کے گھاٹ اتار دیا۔ (99)

مرزا حکیم اپنی پوری قوت کے ساتھ لڑا اور جب ہار گیا تو قریبی پہاڑوں میں جا چھپا۔ چھوٹے اور بوسیدہ پہاڑوں کی گھاٹیاں ہندوستان کی مال و دولت سے آراستہ قوت کے سامنے نبرد آزما تھیں۔ اکبر کی چنیدہ افواج اور اس کے بہترین ہاتھیوں کو پہلے روانہ کیا گیا تھا اور وہ خود ان کے پیچھے زین خان کوکا اور مطلب خان جیسے منجھے ہوئے اور تجربہ کار جنرلوں کے ساتھ آ رہا تھا۔ بقایا فوج دریائے سندھ پر پڑاؤ ڈالے ہوئی تھی۔ (100) اکبر نے اپنی زندگی کی سب سے بڑی فوج کو اس معرکے کے لئے اکٹھا کیا تھا۔ وہ شاید چاہتا تھا کہ اس کے تمام وفادار اور مشکوک امراء اس کی آنکھوں کے سامنے رہیں۔ مقصد کچھ بھی رہا ہو لیکن یہ بالکل واضح ہے کہ

10- منتخب،ii،ص261
11- اسمتھ ،اکبر،عظیم مغل،ص163
12- منتخب،ii،ص261
13- ایضاً،ص259
14- منتخب،ii،ص259
15- منتخب،ii،ص269،366
16- ایضاً،ص301،73-272
17- منتخب،ii،ص272
18- منتخب،ii،ص275
19- The Mutazilete Doctrine
20- منتخب،ii،ص273
21- منتخب،ii،ص273
22- منتخب،ii،ص273
23- ایضاً،ص276،274
24- منتخب،ii،ص281،276
اکبرنامہ،iii،ص285،284
طبقات،ii،ص50،349
25- منتخب،ii،ص260
26- منتخب،ii،ص260
27- ایضاً،ص61،260
28- ایضاً،ص62،261
29- ایضاً،ص61،260
30- منتخب،ii،ص287
31- منتخب،ii،ص287

32- منتخب،ii،ص287

طبقات،ii،ص254

اکبرنامہ،iii،ص317

33- منتخب،ii،ص260،12،211

34- منتخب،ii،ص260،12،211

35- اکاویوا کا خط گوا کے ریکٹر کے نام کا حوالہ،سمتھ ،اکبر،عظیم مغل،ص175

36- منتخب،ii،ص260

37- ایضاً،ص274

38- اکبرنامہ،iii،ص293(بغاوت بنگال کی 9ویں وجہ)

39- منتخب،ii،ص280

طبقات،ii،ص49-348

اکبرنامہ،iii،ص91-290

40- منتخب،ii،ص281

طبقات،ii،ص350

اکبرنامہ،iii،ص287

41- منتخب،ii،ص82-281

طبقات،ii،ص51-350

اکبرنامہ،iii،ص4-301

42- اکبرنامہ،iii،ص5-304

43- ایضاً،ص305

44- اکبرنامہ،iii،ص287

45- ایضاً،ص7-306

منتخب،ii،ص282

طبقات،ii،ص351

وہ اس بغاوت کو کس قدر خطرناک سمجھتا تھا۔

خطرہ اب مکمل طور پر ٹل چکا تھا اور اکبر فتحیابی کے جذبے کے ساتھ کابل میں داخل ہوا۔ اس نے پوری کوشش کی کہ کسی طرح مرزا حکیم کو مجبور کر سکے کہ وہ اس سے آ کر بذاتِ خود ملے لیکن ناکام رہا، اگرچہ اس نے معافی کی درخواست بھیجی، اپنے کئے پر پشیمانی اور معذرت کا اظہار کیا اور اس کو اپنی وفاداری کا یقین بھی دلایا۔ یہی نہیں بلکہ اس نے اپنے بیٹے کو اکبر کے حضور ذاتی طور پر خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لئے بھیجا۔ اکبر نے معافی کا اعلان کیا اور اس کی بادشاہت کو بحال کر دیا۔ (101) مغرب سے ابھرنے والی بغاوت کو مکمل طور پر کچل دینے کے بعد اکبر نے واپسی کا اعلان کر دیا۔

دریائے سندھ کے کنارے بہار کے کیمپ سے شیخ فرید یہ خبر لے کر پہنچا کہ مشرق میں بغاوت کو کچل دیا گیا تھا۔ جب شہنشاہ اکبر دریائے سندھ عبور کرنے کے بعد ہندوستان پہنچا تو راجہ ٹوڈرمل نے دربار میں پہنچ کر ایسی ہی خوشخبری کی اطلاع دی۔

اکبر نے دہلی پہنچ کر اپنے باپ کی قبر پر حاضری دی اور داویجر کی ملکہ، حاجی بیگم کے ہاں قیام کیا۔ شام کے وقت یہ اطلاع آئی کہ اکبر کی ماں ملکہ مریم مکانی دارالخلافہ فتح پور سے اپنے بیٹے کو خوش آمدید کہنے آ رہی ہیں۔ اکبر فوراً اپنی ماں سے ملنے دہلی سے روانہ ہو گیا۔ اکبر فتح پور کی جانب جب مائل بہ سفر تھا تو درباری شاعر شہنشاہ کی شان میں قصیدے پڑھ رہے تھے:

فتح پور میں باد صبا سرسرا رہی ہے
میلوں دور سے میرے شہنشاہ کی آمد آمد ہے (102)

اکبر کی یہ مہم خواہ ہمیں ظلم و تشدد کی ہلکی سی جھلک لئے ہوئے دکھائی دے لیکن ہم عصر تاریخ دانوں کی رائے میں ہندوستان کی تاریخ میں یہ سب سے بڑی بغاوت تھی جس پر قابو پانے میں اکبر کامیاب رہا تھا۔ (103)

شہباز خان پانی پت کے مقام پر اکبر سے آ کر ملا اور بڑی شان و شوکت کے ساتھ اس نے شہنشاہ کے حضور خراجِ عقیدت پیش کیا۔ بہار میں بغاوت کو مکمل طور پر کچلنے کے بعد وہ دارالخلافے میں واپس آیا تھا۔ اس دوران وہ بنگال سے پنجاب تک راج کرتا رہا تھا اور اپنے من پسند لوگوں کو جاگیریں اور سرکاری منصب عطا کرتا رہا تھا اور اس سلسلے میں شہنشاہ کو کوئی اطلاع فراہم نہیں کی گئی

تھی۔اس بارے میں جب اکبر نے اس سے سوال کیا تو اس نے یہ جواب دیا:

محترم شہنشاہ اگر میں ان لوگوں پر یہ انعام واکرام کی بارش نہ کرتا تو وہ سب آپ کے خلاف بغاوت پر آمادہ ہو سکتے تھے۔اب جبکہ آپ کامیاب ہو کر یہاں آ گئے ہیں تو:

ان کو جو چاہیں آپ عطا کریں
جو چاہیں آپ ان سے واپس لے لیں
سپاہی آپ کے ہیں
اور ملک بھی آپ کا ہے۔(104)

بغاوت آخر کار اختتام کو پہنچی۔

حوالہ جات

1- جب اکبر نے قطب الدین خان آغا کو نئے اسلامی نظریے سے آگاہ کرنا چاہا تو اس نے کہا: ''سلطان رم (عثمانی خلیفہ) اور دوسرے بادشاہ کیا کہیں گے جب انہیں ان باتوں کا علم ہوگا؟ خواہ ظاہری طور پر یا حقیقی معنوں میں وہ سب ایک ہی مذہب اسلام پر یقین رکھتے ہیں۔'' (منتخب، ii، ص274)

2- اکبرنامہ، iii، ص270

3- اکبرنامہ، iii، ص270

4- اکبرنامہ، ii، ص271

5- منتخب، ii، ص255

6- منتخب، ii، ص211، 257، 273

7- مشائخ: مسلم اولیاء
رشی: ہندو اولیاء

8- منتخب، ii، ص257-58

9- ایضاً، ص273

46- منتخب،ii،ص283

47- منتخب،ii،ص283

طبقات،ii،ص252

اکبرنامہ،iii،ص308

48- منتخب،ii،ص282

49- اکبرنامہ،iii،ص9-308

50- ایضاً،ص314

51- منتخب،ii،ص77-276

52- ایضاً،ص277

53- منتخب،ii،ص279

54- منتخب،ii،ص291

55- اکبرنامہ،iii،ص335

56- اکبرنامہ،iii،ص292

57- اکبرنامہ،iii،ص309،298

اکبرنامہ،iii،ص309

58- طبقات،ii،ص347

59- منتخب،ii،ص288

طبقات،ii،ص355

اکبرنامہ،iii،ص316

60- اکبرنامہ،iii،ص13،312

61- ایضاً،ص316

طبقات،ii،ص354

منتخب،ii،ص287

62- اکبرنامہ،iii،ص316

63- اکبرنامہ،iii،ص315-16

64- ایضاً،ص319

65- ایضاً،ص319

66- ایضاً،ص333-34

67- اکبرنامہ،iii،ص337

68- بہتر تنخواہ حاصل کرنے والی افواج دھوکہ دینے کی طرف کم مائل ہوتی ہیں۔اکبر کو اس کا اچھی طرح علم تھا۔

69- اکبرنامہ،iii،ص337

منتخب،ii،ص291

70- اکبرنامہ،iii،ص341

71- ایضاً،ص327

72- اکبرنامہ،iii،ص342

طبقات،ii،ص358

73- منتخب،ii،ص292

74- اکبرنامہ،iii،ص343

طبقات،ii،ص358

منتخب،ii،ص292

75- اکبرنامہ،ii،ص343

طبقات،ii،ص358

منتخب،ii،ص292

76- اکبرنامہ،iii،ص343

77- اکبرنامہ،iii،ص343

طبقات،ii،ص358-59

منتخب،ii،ص292-93

78- طبقات، ii، ص363

منتخب، ii، ص295

79- انہوں نے خطوط کو خواجہ کے حوالے کرنے کے بجائے ان کی سیل کیوں توڑی؟ غالباً، جیسا کہ ملک نے جواز پیش کرنا چاہا ہو کہ وہ لوگ بھی خواجہ کے باغیانہ ارادوں پر شک کرتے تھے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ محض کشتی پر کام کرنے والے ملازموں کو ایسی سازش کا علم کیسے ہو سکتا تھا جو اکبر خود یہ کوشش کر رہا تھا کہ اس تک محدود رہے۔

80- اکبرنامہ، iii، ص342-43

منتخب، ii، ص292-93

طبقات، ii، ص358-59

81- سمتھ کے مطابق نظام الدین احمد نے صرف دوسرے خطوط کے بنڈل کو جعلی قرار دیا ہے جبکہ بدایونی تمام خطوط کو ان میں شامل کرتا ہے۔ اکبر، عظیم مغل، ص196۔

طبقات، ii، ص363

منتخب، ii، ص295

82- طبقات، ii، ص363

منتخب، ii، ص295

83- اکبرنامہ، iii، ص342

84- طبقات، ii، ص358

منتخب ii، ص295

85- منتخب، ii، ص285، 275

منتخب، ii، ص285

طبقات، ii، ص254

اکبرنامہ، iii، ص317

86- منتخب، ii، ص285

87- طبقات، ii، ص362

منتخب، ii، ص295

اکبرنامہ، iii، ص790

88- اکبرنامہ، iii، ص342

اکبرنامہ، iii، ص44-343

89- اکبرنامہ، iii، ص345

90- اکبرنامہ، iii، ص47-346

91- اکبرنامہ، iii، ص355، 347

92- ایضاً، ص347

93- اکبرنامہ، iii، ص355

94- اکبرنامہ، iii، ص355

95- ایضاً، ص355

96- اکبرنامہ، iii، ص354

97- ایضاً، ص58-357

98- ایضاً، ص353

99- اکبرنامہ، iii، ص366، 364، 356

100- ایضاً، ص365، 360، 356

101- اکبرنامہ، iii، ص69-367

کابل کی حکومت مرزا حکیم کو بحال کی گئی تھی نہ کہ اس کی بہن کو جیسا کہ اسمتھ نے لکھا ہے۔ (اسمتھ، اکبر، عظیم مغل، 200، اکبرنامہ، iii، ص369، طبقات، ii، ص362، منتخب، ii، ص295)

102- اکبرنامہ، iii، ص374

103- اکبرنامہ، iii، ص374

104- منتخب، ii، ص296

☆☆☆